فرحین اظفر

دیارِ وفا

سوہا اور رمایا دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔

گھر کی نچلی منزل میں ان کے تایا اور تائی اپنی دو بیٹیوں عفت اور نائلہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔

حدید، انس، عفت اور نائلہ کے خالہ زاد ہیں۔ نائلہ، انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس، سوہا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوہا کی تائی کے سامنے کر دیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے، مگر بظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوہا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کر لیتی ہیں۔

نائلہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبو سے روابط بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوہا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوہا رخصت ہو کر انس کے گھر آجاتی ہے۔

حدید کسی کو ڈراپ کرنے جاتا ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

سوہا کے اکیلے پن کی وجہ سے عفت اس کے پاس رک جاتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ حدید کا بھی خیال رکھتی ہے۔

حدید، عفت کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کو جان لیتا ہے اور سوچ لیتا ہے کہ اس بار خالہ کو مایوس نہیں کرے گا۔

نائلہ، شبیر حسین سے ملنا نہیں چھوڑتی اور آخر کار اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے، جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی ہو جاتا ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حدید کے ساتھ نائلہ کی شادی کا فیصلہ کر لیتی ہیں اور اس بات کا اظہار انس اور ماہا سے بھی کر دیتی ہیں۔

حدید، انس کی خاطر نائلہ سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہو جاتا ہے اور شادی کے بعد پوری سچائی سے نائلہ کو بیوی کا درجہ دینا چاہتا ہے، مگر نائلہ نے حدید کو مجبوری کے تحت اپنی زندگی میں قبول کیا اور اس کو وہ مقام نہ دیا جو اس کا حق تھا حدید





خاموش ہو گیا کہ وقت کے ساتھ ساتھ نائلہ اس کو قبول کرلے گی، مگر حدید کی شرافت اور خاموشی کو دیکھتے ہوئے نائلہ کے دماغ میں کچھ اور ہی منصوبے بالا ہی بالا تشکیل پانے لگے، جس پر نائلہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑی کامیابی سے عمل پیرا تھی کہ وہ انس کی نہ ہو سکی تو سوہا اور انس کو بھی جدا کردے گی۔

ماہا کی شادی حبیب سے بخیر و خوبی ہو جاتی ہے۔ ماہا حبیب کے ساتھ دبئی چلی جاتی ہے، ماہا حبیب سے شادی کے بعد اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت لڑکی سمجھنے لگتی ہے، مگر اس کو پتا چلتا ہے کہ حبیب ایک بیٹے کا باپ ہے اور وہ فوراً" پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیتی ہے۔

سوہا امید سے ہوتی ہے، مگر نائلہ بڑی عمدگی اور کامیابی سے سوہا کو اس خوشی سے محروم کردیتی ہے اور اس حادثے کے بعد انس کو اپنی زیادتی کا احساس ہوتا ہے اور وہ سوچ لیتا ہے کہ اب سوہا کو کوئی غم نہیں دے گا۔ نائلہ اسپتال میں شبیر حسین کو دیکھ کر چکرا جاتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ شبیر حسین نے اس کو نہیں دیکھا، مگر شبیر حسین نائلہ کا پیچھا کرتے کرتے اس کے گھر پہنچ جاتا ہے اور نائلہ نہ چاہتے ہوئے بھی شبیر حسین کے جال میں گھر جاتی ہے۔

حبیب ماہا کو منالیتا ہے اور پاکستان آجاتا ہے، مگر ماہا پھر غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہے اور حبیب کے ساتھ جانے سے منع کردیتی ہے۔ حبیب اکیلا ہی دبئی جانے کے لیے روانہ ہو جاتا ہے کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

عفت کا نکاح معراج کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جس کا حدید کو پتا چلتا ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

تیرھویں قسط

مزنہ جلے پیر کی بلی کی طرح گھر کے کونے کونے میں منڈلا رہی تھیں۔ بچوں کو انہوں نے مقررہ وقت سے ذرا پہلے ہی اپنی ایک جاننے والی کے گھر بھجوا دیا تھا اور اب انہیں رات میں ہی وہاں سے واپس آنا تھا۔

صادق نے ہی مزنہ سے رات کے کھانے پر اہتمام کر کے ولید اور ڈونی کو گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ ان دونوں کو قبل از وقت ماہا کی تنک مزاجی، تلخی اور سخت زبان سے واقفیت کروا دیں۔ اور یہ بھی تفصیلاً" واضح کردیں کہ اگر انہیں اور خاص طور پر ڈونی کو حبیب سے ملاقات کر کے ہی واپس جانا ہے تو یہ ملاقات ماہا کی غیر موجودگی میں ہی ممکن ہے۔ ورنہ ماہا سے کچھ بعید نہیں کہ موقع محل کی مناسبت کا خیال کیے بغیر ہسپتال میں غدر مچا دے۔

انہیں افسوس تھا کہ چند دن پہلے تک جو خیالات ان کے مزنہ کے بارے میں تھے کہ وہ جذباتیت کا شکار ہو کر بے مقصد کا شور مچا رہی ہیں۔ وہی خیالات اب ان کے ماہا کے بارے میں بھی تھے۔

حالانکہ دونوں کی عمروں میں واضح تفاوت تھا۔ لیکن ذہنی ناپختگی کو اگر دیکھا جاتا تو یہ فرق بالکل مٹ جاتا۔

فی الوقت تو وہ تیار ہو کر ان دونوں ماں بیٹے کو اس ہوٹل سے پک کرنے جا چکے تھے، جہاں سے پاکستان آنے کے بعد انہوں نے فون کیا تھا۔ وہ دونوں اسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ کچھ راستوں سے مکمل طور پر انجان تھے۔ اس لیے کہیں بھی آنے جانے کے لیے فی الحال انہیں صادق کی معاونت کی ضرورت بھی تھی۔

مقررہ وقت پر جب وہ گاڑی وسیع و عریض پارکنگ میں کھڑی کر کے ہوٹل کے ریسپشن تک پہنچے تو ان کے دونوں مہمان انہیں ریسپشن ڈیسک کے سامنے بنے ویٹنگ ایریا میں ہی مل گئے۔

صادق نے ان دونوں کی تصاویر نیٹ کے ذریعے سے حاصل کرلی تھیں۔ اس لیے انہیں، ان کو پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔

ڈزنی ایک بے حد سفید رنگ اور سنہرے بالوں والی دبلی پتلی درمیانے قد کی عورت تھی۔ اس کی اٹھی ہوئی ستواں ناک اور چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھوں کے ساتھ بوائے کٹ سے ذرا لمبے بال اسے مکمل طور پر بدیسی ثابت کرتے تھے۔ البتہ ولید اس کا قد صادق سے بھی چند انچ نکلتا ہوا تھا۔ سیاہ بال سیاہ آنکھیں گوری رنگت اور بھرا ہوا جسم۔

چہرے کے خدوخال مشرق و مغرب کے امتزاج کے ساتھ لڑکپن کی ایک خاص معصومیت لیے ہوئے تھے۔ اس نے جیسے ہی صادق کو دیکھا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور سلام کرتے ہوئے کچھ اس قدر بے تابانہ انداز میں آگے ہوا کہ صادق نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔

اس کے چوڑے شانوں اور مضبوط کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ عجیب سی ناقابل بیان کیفیات کا شکار ہو چلے تھے۔

"میرا خیال ہے ہمیں نکلنا چاہیے۔ میری وائف مزنہ اور آپ کی آنٹی ڈنر پر آپ لوگوں کا انتظار کر رہی ہیں۔" جب اس نے ان کی بات پر سر ہلا کر پاس رکھا بیگ اٹھایا اور پلٹ کر ڈزنی سے انگلش میں یہی بات کہی۔ اس کے بعد سیدھا ہو کر ان کے سامنے آیا تو لمحہ بھر میں صادق صاحب کی تمام انجانی کیفیات ایک مبہم سے تفاخر میں بدلنے لگیں۔

"بلاشبہ اگر اس کی پیدائش کو لوگ تضحیک کے نشانے پر نہ رکھیں۔ تو ایسا بیٹا ہی ہر باپ کی خواہش ہوا کرتا ہے۔ جوان کے شانہ بشانہ چلے تو باپ کا سینہ اور کندھے اور چوڑے ہو جائیں۔"

صادق نے پارکنگ لاٹ میں گاڑی تک پہنچتے ہوئے ایک۔ چھلکتی ہوئی سی چور نگاہ ایک بار اور اس پر ڈالی۔

جس وقت وہ لوگ گھر پہنچے' رات کی تاریکی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ راستہ بھر خاموشی رہی اور گھر آگیا۔ مزنہ بڑے رسمی انداز میں قدرے ہوائیاں اڑے چہرے کے ساتھ ملیں۔ یوں بھی ڈزنی جیسی خالصتاً" انگریزی شخصیت رکھنے والی عورت سے وہ زندگی میں پہلی بار ملی تھیں اور جس لڑکے کو حسیب کا بیٹا بتایا جا رہا تھا۔ وہ جب پورے قد سے ان کے سامنے کھڑا ہوا تو ان کی آنکھیں ہی پھٹ گئیں۔

بمشکل اٹک اٹک کر اپنا تعارف کروایا اور ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر صادق صاحب کو اشارہ کرتی باہر نکل گئیں۔

"یہ... یہ لڑکا کون ہے۔" وہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئے تو مزنہ نے بے چین سی ان کے نزدیک آگئیں۔

"یہی ولید ہے۔ جس کے بارے میں حسیب نے ہم سب سے چھپایا اور جس کو ڈاکومنٹس میں اون کیا ہے اس نے۔ جس کا خرچہ' پڑھائی اور دوسرے اخراجات پورے کرتا ہے۔ ایک ذمہ دار باپ کی طرح۔"

انہیں ضرورت نہیں تھی اتنی وضاحت دینے کی۔ لیکن اس کا قد کاٹھ دیکھ کر شک میں پڑ جانے والی مزنہ کو یقین دلانے کے لیے اتنی لمبی بات ضروری تھی۔

"اتنا بڑا... اتنی عمر کا لڑکا... جوان جہان۔" مزنہ کے دل و دماغ ماننے سے انکاری تھے۔ صادق صاحب اب کی بار بنا کچھ اس وقت تک جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ جب تک کہ مزنہ ڈھیلی ہو کر سر نہ جھکا گئیں۔

"تمہیں یاد ہونا چاہیے کہ وہ کن حالات میں اس دنیا میں آیا اور کن حالات میں یہاں تک پہنچا ہے۔ تمہاری یہ بے جا تفتیش اور تشویش' فضول کی حیرانگیاں اسے پشیمان بھی کر سکتی ہیں۔ اور حسیب کی ناراضی کا سبب بھی بن سکتی ہیں۔ اس لیے آئندہ خیال رکھنا۔"

"جی... میں کھانا لگادوں۔"

"پہلے دو چار گھڑی ان کے پاس بیٹھو۔ ان سے ان کے بارے میں، مسیب کے بارے میں بات کرو تسلی دو کچھ۔ وہ یہاں کھانا کھانے نہیں آئے ہیں۔" صادق کا انداز ملامت آمیز تھا۔

"اور ہاں... ماہا کا ذکر مت کرنا۔ میں یہ ٹاپک کھانے کے بعد چھیڑوں گا ورنہ عین ممکن ہے وہ لوگ ٹھیک سے نہ بات کر سکیں نہ کھانا کھا سکیں۔" واپس ڈرائنگ روم تک جاتے جاتے مزید پوری طرح اپنے شوہر کی فراست کی قائل ہو چکی تھیں۔

☆ ☆ ☆

کافی سے زیادہ رات گزرنے کے بعد جب اس کی آنکھیں نیند سے بالکل بند ہونے کو تھیں تب بھی موبائل اسکرین خاموش پڑی تھی۔

اس نے شکوہ کناں نگاہوں سے اسکرین کو گھورا اور آنکھیں موند لیں۔ دوسری جانب دو آنکھیں بے بسی سے اپنے سیل فون کو گھورتی ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ پھر چند لمحوں بعد وہ نظریں ایک بوڑھے وجود پر جم گئیں۔ بتول نے اپنا دوسرا پیر دبوانے کے لیے اسے بٹھایا تھا اور اب تک وہ پوری طرح نیند میں جا چکی تھیں لیکن جونہی معراج نے ہاتھ ہٹا کر پلنگ سے اترنا چاہا وہ فوراً ہوشیار ہو گئیں۔

"ہوں... ہوں... ٹھیک سے دبا۔" انہیں جانے کیسے نیند میں پتا چل گیا۔ معراج جاتے جاتے ٹھہر گیا۔ آدھے گھنٹے میں لگاتار تیسری کوشش کے بعد اسے رہائی ملی لیکن تب تک دوسری طرف انتظار کی کیفیت نیند کی میٹھی آغوش میں سر رکھ چکی تھی اس نے گہری سانس لے کر فون رکھ دیا۔

مسلسل تین دن تک بتول کا معمول، معراج کی ناکام کوششیں اور عفت کا انتظار لاحاصل ہی رہا۔ چوتھے دن شاید بتول کو اس کی حالت پر رحم آگیا انہوں نے جلدی چھوڑ دیا۔

معراج ان کے پاس سے اٹھا تو خیال تھا کہ عفت بھی اسی کی طرح بے تابی سے فون کے انتظار میں جاگ رہی ہوگی، لیکن دوسری طرف بیل جاتی رہی اور جب وہ بالکل مایوس ہو کر لائن کاٹنے والا تھا تب ریسیور سے عفت کی آدھی سوئی آدھی جاگی آواز ابھری۔

"ہیلو عفت! کیا ہوا سو گئی تھیں کیا۔"

"جی..."

"کیوں۔" اسے تعجب ہوا اور اس کے تعجب پر عفت کو...

"کیوں... کیا مطلب۔ کیا آج بھی خوار ہونے کے لیے جاگتی۔" معراج کے لب مسکرا اٹھے۔

"اس کا مطلب تم اتنے دن سے میرے فون کے انتظار میں تھیں۔"

"جی نہ صرف انتظار میں بلکہ بہت شدت سے انتظار میں..." اس کی آواز میں محبت بھری شوخی نہیں بلکہ بے حد سنجیدگی تھی۔ معراج چند لمحے اس کا انداز بوجھتا ہوا رک سا گیا۔

"خیریت ہے۔"

"خیریت ہی تو نہیں ہے۔ آپ کی بہنیں آئی تھیں ناامی سے رخصتی کی بات کرنے۔" عفت اسی سنجیدگی سے بات بڑھاتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس موضوع پر معراج سے کھل کر بات کرے گی۔

"میرے یہاں کوئی کماؤ پوت بھائی نہیں بیٹھے۔ نہ میرا اپنا کوئی خاص ذریعہ آمدنی ہے۔ ابا کی پنشن سے عزت سے گزارا ہو رہا ہے۔ یہی بہت ہے اور دوسری بات یہ کہ سب ہی والدین جہیز کے نام پر لڑکیوں کو کچھ نہ کچھ تو دیتے

ہی ہیں۔"

"تو پھر کس بات کی ٹینشن ہے، جو ہو سکے کر لینا۔" معراج کے لاپروا لہجے سے عفت کو دھچکا سا لگا۔

"یعنی... آپ کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"میرے نزدیک ان فضول باتوں کی کوئی اہمیت نہیں جن کا کوئی سر پیر سرے سے ہو ہی نا!" عفت جواب میں کچھ کہنے کے بجائے خاموش ہی رہی اور جب یہ خاموشی طول پکڑنے لگی تو معراج اکتا گیا۔

"اب خاموش کیوں ہو گئیں تمہیں بری لگی ان کی بات۔ میں سوری کر لیتا ہوں بس۔"

"بری لگنے کی بات نہیں ہے۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بات کرے۔

"تو پھر... کیا بات ہے کھل کے کہو نا!"

"میں نہیں چاہتی کوئی ہماری خاموشی کی وجہ سے لمبی چوڑی امیدیں باندھ لے کیوں کہ امیدیں ٹوٹتی ہیں تو رستے کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔"

"رشتے اعتبار اور اعتماد سے بنتے ہیں۔ امیدوں سے نہیں۔"

"پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ اگر آپ کی امی اور بہنوں کو کسی لمبے چوڑے جہیز کی خوش فہمی ہے تو وہ دور کر لیں۔" اس کا لہجہ قطعی تھا۔ معراج خاموش سا ہو گیا۔

"دیکھو عفت... میں ان کا اکلوتا بیٹا اور بھائی ہوں اور میری جو شادی پہلے ہوئی تھی اماں نے ان لوگوں کو سب سامان واپس بھجوا دیا ہے۔"

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں کہ انہیں اس لیے مجھ سے ٹرک بھر کے سامان چاہیے۔"

"پاگل ہو گیا تم... میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ انہیں ان مادی اشیا کا لالچ نہیں ہے جب انہوں نے گھر میں رکھا ہوا سامان واپس بھجوا دیا حالانکہ اس کی ڈیتھ کے بعد سارا سامان میرا تھا میرا حق تھا، لیکن پھر بھی انہوں نے پروا نہیں کی تو اب کیوں کریں گی وہ ایسا۔" عفت خاموش ہو کر سوچ میں پڑ گئی۔ معراج یا تو واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا یا اس کی بات سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

"بہر الحال... میں نے ان کی باتیں اپنے کانوں سے سنی ہیں اور میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ..." وہ رک سی گئی۔

"میں نے ان کی باتوں سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے۔ وہ غلط نہیں ہے۔"

"تو پھر میری بھی ایک بات سن لو۔" معراج کو اس کی سنجیدگی اور اس کی بات دونوں ہی ناگوار گزریں۔

"اتنی جلدی اتنی بدگمانی کو دل میں جگہ دینے سے بھی رشتوں پر فرق پڑتا ہے۔" فون عفت کان سے لگا رہ گیا لائن بے جان ہو گئی اور شاید وہ خود بھی...

☆ ☆ ☆

مون سون گزرنے کے بعد بادلوں نے شہر کا رخ کیا تھا۔ دن بھر ابر آلود موسم میں چلتی ٹھنڈی ہوائیں دل و دماغ کو سرشار کیے رکھتی تھیں۔ اس روز بھی موسم ایسا ہی خوش گوار تھا۔ اسی لیے وہ وارڈ بوائز کی مدد سے حسیب کو ویل چیئر پر بٹھا کر باہر لان میں نکل آئی۔ اس کے زخم بے شک گہرے تھے، لیکن خدا کے فضل سے کوئی بھی ہڈی ٹوٹنے یا فریکچر سے محفوظ رہی تھی۔ اتنا کچھ ہو جانے اور سہ لینے کے بعد ایک شکر گزاری کی کیفیت اس کے روم روم میں بستی اسے پرسکون کیے رکھتی تھی۔ دھیرے دھیرے وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی وہ دور نصب ایک سنگی بنچ کے نزدیک لے گئی۔ پھر خود سامنے آ کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ ہلکے گلابی رنگ کے کپڑوں کا ملگجا پن صاف نمایاں تھا ایسی ہی

نمایاں تھکن زدہ اس کی آنکھیں اور چہرہ تھا پھر بھی سامنے آتے ہی حسیب کتنی دیر تک اسے دیکھے گیا۔ یہاں تک کہ وہ نروس سی ہوگئی اور اس کا دھیان ہٹانے کو پوچھنے لگی۔

"کیسا لگ رہا ہے۔"

"خواب سا۔" حسیب کا لہجہ بھی کمزور تھا اور آواز بھی دھیمی

"میں نے موسم کا پوچھا ہے۔" اس نے ہنس کر آس پاس نگاہ ڈالی۔ حسیب بھی یونہی ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"سب کچھ خواب کے جیسا ہے۔ میرا بچ جانا۔ تمہاری موجودگی' توجہ محبت۔۔۔ تمہارا ساتھ اور یہ موسم سب کچھ۔۔۔"

"یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ آپ یقین کرلیں۔"

"یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" اس کا چہرہ پل بھر میں رنگ بدل کر اداس سا ہوگیا۔ وہ اب گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔

"کیوں جی نہیں چاہتا۔"

"کیوں کہ بعض اوقات انسان کو حقیقت سے نظریں ملا کر شرمندگی کے سوا کچھ اور ملتا جو نہیں۔"

"شرمندگی۔۔۔ کیسی شرمندگی۔" ماہا الجھ سی گئی۔ البتہ اس کے ہونٹ اب بھی مسکرا رہے تھے۔

"وعدہ وفا نہ کرنے کی شرمندگی۔"

"پھر تو شرمندہ مجھے ہونا چاہیے۔ میں نے زندگی بھر آپ کا خیال رکھنے اور ساتھ نباہنے کا وعدہ کیا تھا اور میں اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکی۔" اس نے نظریں جھکالیں۔ وہ واقعتا" شرمندہ تھی۔

"تمہاری شرمندگی بجا ہے' لیکن میں۔۔۔ میں صرف تم سے شرمندہ نہیں ہوں۔ کوئی اور بھی ہے میری زندگی میں جس کا واحد سہارا میں تھا اور۔۔۔ جس کا خیال رکھنے کا وعدہ کیا تھا میں نے زندگی بھر کے لیے۔" ماہا کا منہ کھل گیا۔ حسیب کس کی بات کر رہا تھا اور کون سے وعدے وفا نہ کرنے کا کہہ رہا تھا۔ موسم کی ساری خوب صورتی جل کر راکھ ہوگئی۔

"جانے کسی نے اس کی خبر بھی لی یا نہیں۔ پتا نہیں اس کی حالت کیسی ہوگی۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں ہوگا کہ میں کتنے دن ہوش سے بے گانہ پڑا یہاں زندگی اور موت کی جنگ لڑتا رہا۔ کوئی تھا بھی تو نہیں جو اسے خبر کردیتا۔" ماہا کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ حسیب پژمردگی سے جانے اور بھی کیا کیا کچھ کہتا رہا۔ ماہا کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔

"میرا خیال ہے ہمیں اب اندر چلنا چاہیے۔" وہ تھک کر خاموش ہوا تو اس کے پاس کہنے کو صرف یہی ایک بات رہ گئی۔

"ماہا۔۔۔! میرا ایک کام کردو پلیز۔" حسیب نے ملتجی انداز میں اسے کھڑے ہوتا دیکھ کر اس کی کلائی تھامی تھی۔ ماہا ایک عجیب سے امتحان میں پڑگئی۔

✡ ✡ ✡

گرما گرم آلو کے پراٹھوں کی خوشبو فضاؤں میں پھیلی' بھوک کی شدت میں اضافہ کررہی تھی۔ حسب معمول نائلہ کچن میں مستعدی سے کام نمٹا رہی تھی۔ اس نے صبح صبح آفس کے لیے نکلنے سے پہلے حدید کے لیے ناشتے کا مینو ترتیب دیا تھا جس میں ہمیشہ کی طرح انس نے آکر شامل ہوجانا تھا' لیکن انس کے تیار ہو کر نیچے آنے سے پہلے ہی سوہا چلی آئی۔

"پلیز ذرا تم ایک چولہا خالی کر دو۔ مجھے انس کے لیے بھی ناشتا بنانا ہے۔" اس نے ایک لمحے ٹھٹک کر اس اہتمام کو دیکھا۔ پھر مصروف سے انداز میں بولتے ہوئے آگے آئی۔ مقصد صرف یہ جتانا تھا کہ اس ہنگامی صورت حال میں نائلہ کے اہتمام سے بنائے گئے ناشتے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔

"ان کے لیے الگ سے بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے بنایا ہے نا! تم انس کو بلا لو نیچے۔۔۔ بلکہ تم خود بھی۔۔۔" مصروف سی بولتی ہوئی نائلہ کی بات سوہا نے سوکھے منہ سے کاٹ دی۔

"نائلہ پلیز۔۔۔ تم یہ مہربانیوں کا سلسلہ یہیں ختم کر دو تو بہتر ہوگا۔" اس کا انداز اس قدر خشک تھا کہ توے پر جلتا پراٹھا چھوڑ کر نائلہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"وجہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ تمہارا اس طرح بڑھ بڑھ کے انس کے لیے کام کرنا نہ صرف مجھے ذاتی طور پر پسند نہیں بلکہ اس طرح کی اوچھی حرکتوں سے میرے اور ان کے تعلقات بھی خراب ہوتے ہیں میں اب تمہاری وجہ سے اپنی زندگی میں مزید کوئی گڑبڑ نہیں چاہتی۔" کچن کی طرف آتے حدید کے کانوں میں بھی سوہا کے الفاظ پڑ چکے تھے۔ وہ دروازے کی دہلیز پر ہی ساکت ہو گیا۔

"آج ایک جگہ سے امید بندھی ہے۔ انٹرویو کے لیے جا رہے ہیں۔ آپ دعا کیجئے گا حدید بھائی۔" لمحے بھر میں حدید کو دیکھتے ہی سوہا کا لہجہ اور انداز سب بدل گیا۔ نائلہ تو نائلہ خود وہ بھی اپنی اس کایا پلٹ پر حیران رہ گئی اور کچھ یہ تھا کہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ' حدید ان کی باتوں کا کچھ حصہ سن چکا ہے۔ اس لیے جلدی سے پلٹ کر چائے کا پانی چڑھانے لگی۔

✻ ✻ ✻

کئی گھنٹوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے صادق بھائی کو فون کر کے ساری بات بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔

"میں نہیں چاہتی کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی یہاں پاکستان آئے اور حسیب سے ملے۔" ماہا کا لہجہ بے حد حتمی تھا۔ صادق خود بھی چور سے بن گئے۔

"لیکن کیوں بیٹا!" ماہا ان کے لیے بیٹیوں جیسی ہی تھی۔

"اس عورت تک تو ٹھیک ہے کیوں کہ حسیب کا اور اس کا رشتہ دوستی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا' لیکن وہ بچہ۔۔۔" وہ دانستہ رک گئے۔

"جی کیا۔۔۔ بولیں میں سن رہی ہوں۔" اس کا چہرہ حدت پکڑنے لگا۔

"وہ بچہ تو حسیب کو ہی اپنا باپ کہتا اور مانتا ہے اور اب تک تو اس تک حسیب پر گزرنے والے حادثے کی خبر پہنچ بھی چکی ہے۔ اگر وہ آ جائے گا تو ہم اسے روک نہیں سکتے بیٹا۔ وہ حسیب کی اولاد ہے اور حسیب نے اسے اون کیا ہے۔" ماہا چند لمحوں کے لیے چپ سی رہ گئی۔

"آپ میری بات مانیں۔۔۔ اسے حسیب سے ملنے دو۔" کہنا کتنا آسان تھا۔ اس نے کرب و اذیت سے آنکھیں بند کر لیں۔

"آپ کے لیے یہ کہنا آسان ہے صادق بھائی' لیکن میں۔۔۔ میں اپنے دل کا کیا کروں۔ آپ اسے میری حسیب سے بے انتہا محبت سمجھ لیں کہ مجھے اس میں بٹوارہ منظور نہیں کسی بھی صورت۔۔۔"

"شوہر کا بٹوارہ تو دوسری بیوی کرتی ہے بیٹا۔ اس کی اولاد نہیں۔" ماہا کو لگا وہ ابھی بات کے اختتام پر ہلکے سے مسکرائے ہوں۔

"میرا دل نہیں مانتا۔" وہ جیسے بے بس سی ہو گئی۔

"دل نہیں مانتا تو دل کو سمجھاؤ۔ یاد رکھو۔ دل اور دماغ میں زندگی کے نوے فیصد حصے میں جنگ ہی چلتی ہے اور یہ جنگ جتنی زیادہ دماغ جیتے گا۔ تم اتنے ہی فائدے میں رہو گی۔ اپنے دل کو دماغ کا تابع بناؤ۔ دماغ کو دل کا تابع بنانے سے نقصان تم خود ہی اٹھاؤ گی۔" ماہا کے پورے وجود پر برف سی گرنے لگی۔ ایک سرد اور جامد کیفیت نے اسے اپنے حصار میں لینا شروع کر دیا۔

"اپنے ذہن سے پوچھو۔ یوں زور زبردستی سے تم کتنے دن ان دونوں کو ایک دوسرے سے دور کر سکو گی۔ ان شاء اللہ ایک دن حسیب صحت یاب ہو گا تب کیا ہو گا۔ سب سے پہلے وہ اسی سے ملنے جائے گا نا! اس کا وہ پیارا اور عزیز سگا بیٹا جو اس سے دور ہے اب تک۔ تم تو اس سے مل لیں۔ اس کے پاس بھی آ گئیں، لیکن وہ ولید۔ وہ تو ابھی تک باپ سے ملنے کو ترس رہا ہے اور بعد میں جب حسیب کو پتا چلے گا کہ ان دوریوں کا سبب تم تھیں تو سوچو اس کے دل میں تمہاری کتنی عزت رہ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر تم دل کو ذرا سا سمجھا بجھا کر اس بات کے لیے راضی کر لو تو یہ چیز حسیب کے دل میں تمہاری اہمیت میں اضافہ ہی کرے گی۔" صادق بولتے بولتے تھک سے گئے۔ انہیں امید نہیں تھی کہ انہیں مزنہ کی طرح ماہا کو بھی ساری صورت حال اور اونچ نیچ نئے سرے سے سمجھانی پڑے گی۔ اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے ایک آخری پتا پھینکا۔

"اگر میری بات مانو تو آج رات گھر چلی جاؤ اور کل کا دن گھر پر رک کر آرام بھی کر لو اور اپنی امی اور بہن سے اس ٹاپک پر مشورہ بھی کر لو۔ تھکے ماندے ذہن سے انسان ویسے بھی کوئی ڈھنگ کا فیصلہ نہیں کر پاتا۔" ماہا نے بے خیالی میں سر ہلا دیا۔ اس وقت تو اس نے یونہی حامی بھر لی تھی، لیکن شام ہوتے ہوئے جب صادق بھائی سچ مچ اسے لے جانے کے لیے آ گئے تو اپنے ٹوٹتے اعصاب کو ذرا آرام دینے کے لیے اس نے بھی رخصت سفر باندھ ہی لیا۔ اس بار صادق بھائی کے ساتھ ساتھ حسیب کی حمایت بھی شامل اصرار تھی۔

"میں پھر کل۔۔۔ کل شام تک آجاؤں گی۔" چلتے چلتے اس نے حسیب کا ہاتھ تھام لیا۔ کمرے میں اس وقت وہ دونوں ہی تھے۔

"دل نہیں چاہتا اب ایک پل کو بھی آپ سے دور جانے کا۔" اس کے لہجے میں سچائی کی چھب تھی اور آنکھوں میں محبت کا ایک سمندر موجزن تھا۔ ایک ایسا سمندر جو خود بھی صدیوں سے پیاسا لگتا تھا۔

✡ ✡ ✡

انس انٹرویو دے تو آیا تھا، لیکن زیادہ پر امید نہیں تھا۔ شام کی چائے بنا کر سوہا چھت پر ہی لے آئی۔ بادلوں کی راجدھانی قائم تھی۔ کہیں کہیں گھروں میں لگے درخت تیز ہوا سے جھوم رہے تھے۔ اس ٹھنڈی ہوا اور ابر آلود موسم میں دل کو نئی نئی گدگداہٹیں سوجھتی ہیں۔ یہی حال سوہا کا تھا۔ بلاوجہ میں مسکرائے جانا، شوخی اور شرارت بھری باتیں کرنا۔ چھیڑ چھاڑ اور پر لطف چٹکلے۔ اچھے خاصے بور مزاج بندے بھی اپنا خول تڑخا کر باہر نکل آتے ہیں وہ تو پھر تھی ہی شوخ و چنچل سی، لیکن انس۔۔۔ چائے کا کپ آدھا خالی ہو چکا تھا اور وہ دور آسمان پر منڈلاتے طائروں پر نگاہ جمائے جانے کن سوچوں میں گم تھا۔

"کیا بات ہے۔ آج بڑے چپ چپ ہیں۔" انس جواب دیئے بنا یونہی چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔ سوہا نے چند لمحے تو اس کے جواب کا انتظار کیا پھر خود ہی کوئی نتیجہ اخذ کرتی منڈیر سے ہٹ کر اندر کی طرف دیوار سے لگا کر رکھے گئے بنچ پر جا کر بیٹھ گئی۔

"جاب کی وجہ سے پریشان ہیں۔" انس ابھی بھی وہیں کھڑا تھا۔ سوہا کو اس کی خاموشی الجھانے لگی۔

"کیوں پریشان ہو رہے ہیں ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔" اب کی بار اس نے محض سرہلایا۔ سوہا تیزی سے اٹھ کر واپس منڈیر تک آئی تو دور کسی گھر کی چھت پر چند ایک رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔

"اچھا... ا... اب سمجھی... میں جناب کی اداسی دور کرنے کو تسلیاں دے رہی ہوں اور یہاں پر آنکھیں سینکی جا رہی ہیں۔" اس نے جان کر انس کو اس گمبھیر خاموشی سے نکالنے کی خاطر یہ حربہ آزمایا تھا۔ انس پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ ایک دم جھینپ سا گیا۔

"کیا پاگل ہو گئی ہو۔ تمہیں لگتا ہے میں یہاں کھڑا ہو کر یہ حرکتیں کر رہا ہوں۔"

"پہلے نہیں لگ رہا تھا، لیکن اب لگ رہا ہے۔" اس نے آنکھیں نچائیں۔

"دماغ خراب ہے۔ کیا محلے سے پٹوا کر نکلواؤ گی ہمیں۔ مطلب مجھے اور میرے بھائی کو۔ پورے محلے کی کڑی چوکیداری ہوتی تھی ہمارے گھر اور ہماری حرکتوں پر... چھڑے تھے نا! کسی محلے والی سے چکر نہیں چلا سکے۔" وہ اپنے سابقہ موڈ سے باہر آچکا تھا۔ بڑے ہی دکھ بھرے انداز میں دلی حسرت بیان کی۔ سوہا ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔ انس ہنستی ہوئی سوہا کو تکنے لگا۔ اس کی ہنسی تھمی تو حیرت سے پوچھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھنے لگے۔"

"سوچ رہا تھا کہ تم اگر اسی طرح ہنستی رہو تو کیا ہی بات ہے۔"

"آپ ہمیشہ ایسے ہی باتیں کریں گے تو ہنستی ہی رہوں گی نا!"

"ہم... م... م۔" اس نے چائے کا خالی کپ رکھ کر پھر سے منڈیر پر ہتھیلیاں دھریں۔

"ہر کام کا، چیز کا اور بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔ وہ وقت نکل جائے نا! تو نہ بات کی وہ اہمیت رہتی ہے نہ چیز کی قدر اور نہ کام کا فائدہ... ہر چیز اپنے وقت اور موقع محل کے حساب سے اچھی لگتی ہے۔" اس کا اداسی میں گھرے لہجے میں کسی یاد کی چنگاری تپش دے رہی تھی۔

"تو کیا محبت بھی وقت گزرنے کے بعد بے فائدہ ہو جاتی ہے۔" سوہا نے جانے کیوں پوچھ لیا۔ شاید اس کا دل مضطرب سا ہو گیا تھا۔

"اگر وقت پر اظہار نہ کیا جائے... تو شاید..."

انس پریشان تھا یہ کہنے کی ضرورت تھی نہ بتانے کی۔ پھر بھی اس نے فوری طور پر اس کی دلجوئی کی خاطر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، لیکن ٹھیک اسی وقت اسے زور کی ابکائی سی آگئی۔ یوں لگا پل بھر میں جیسے کلیجہ باہر کو الٹ پڑے گا۔ وہ بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھتی اندر کمرے میں بھاگی۔ انس بھی تشویش سے اسے دیکھتا اس کے پیچھے تھا۔ بظاہر

اب چھت پر خاموشی اور اندر کمرے میں آوازیں تھیں، لیکن چھت سے جڑی سیڑھیوں پر کوئی اور بھی تھا جو خاموش کھڑا چند باتیں سن چکا تھا۔
اس نے ہوا کے دوش پر لہراتا آنچل مٹھی میں دبوچا اور سسکتے دل کو تھپکتی واپس سیڑھیاں اتر گئی۔ اس کے کانوں میں ایک آواز کی گونج تھی۔
"اگر وقت پر اظہار نہ کیا جائے تو... شاید..."
"شاید..."
"شاید..."

☆ ☆ ☆

صادق نے ماہا کو گھر چھوڑتے ہی واپس اپنے گھر کا رخ کیا۔ وہ چاہنے کے باوجود ولید اور اس کی ماں کی آمد کی پیشگی اطلاع نہ حبیب کو دے سکے تھے۔ نہ ماہا کی موجودگی کے باعث اسے اشاروں میں ہی کچھ بتا سکے تھے۔ اب وہ ولید اور ڈزنی کو حبیب سے ملوانے لے کر جا رہے تھے۔ ولید بے حد بے تابی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا مطلوبہ کمرے کے سامنے جا رکا۔ پھر اپنے بے ترتیب تنفس کو ذرا ہموار کیا اور بے حد آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔
حبیب کو اسی وقت ایک میل نرس، اس کے کہنے پر تکیے کے سہارے بیڈ پر، لیٹے سے بٹھا کر گیا تھا اور وہ اس وقت ایک دن پرانا باسی اخبار عدم دلچسپی سے یونہی الٹ پلٹ کر رہا تھا تب ہی دروازہ کھلا۔ اس نے بے دھیانی میں نظریں اٹھائیں اور پھر اس کی نظریں وہیں دروازے پر ساکت رہ گئیں۔ آنے والے شخص کو بھی شاید اسے اس مخدوش حالت میں ملنے کی توقع نہیں تھی۔ باپ بیٹا دونوں کا منہ بیک وقت کھلا رہ گیا۔
"ولی... ! میرا بیٹا۔"
"پاپا۔" ولید کی آواز البتہ پورے کمرے میں واضح طور پر سنائی دی تھی۔ اگلہ لمحہ بے حد جذباتی تھا۔ وہ آگے بڑھا اور حبیب کی کھلے بازوؤں میں بے تابانہ سما کر سسک پڑا۔
"آپ کہاں چلے گئے تھے اتنے دن... یہ سب کیا ہوا، کیسے ہوا...؟" حبیب اسے خود سے لگائے ہولے ہولے سہلاتا اور تھپکتا رہا۔ اس کے کانوں میں ننھی منی پیار بھری سرگوشیاں کرتا رہا۔
"میں ٹھیک ہوں میرے بچے... اب تمہیں دیکھنے کے بعد تو بالکل فٹ فاٹ ہو گیا ہوں۔"
"میری یاد آتی تھی تو کیا جب بھی ایسے ہی روئے تھے۔ جسٹ لائیک آ بے بی بوائے... ہم... م... م۔"
دھیرے دھیرے اس کی یہ سرگوشیاں، ولید کے کانوں میں مدھ ٹپکاتی اس کے آنسوؤں کو مسکراہٹ میں بدلتی چلی گئیں۔
"اب بتاؤ... سب سیٹ ہے ینگ بوائے۔"
"سب سیٹ تھا۔ اب نہیں ہے... مجھے جب آپ کا پتا چلا تو سمسٹر اسٹارٹ ہونے والا تھا اور میں سب چھوڑ کر پاکستان آ گیا۔" اس کا لہجہ ندامت آمیز تھا۔ حبیب بنا کچھ کہے اسے دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا ولید کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔
"میں نے کوشش کی تھی تیاری کرنے کی، لیکن... مجھ سے پڑھائی نہیں کی گئی۔ ہو ہی نہیں سکتی تھی پاسیبل نہیں تھا میرے لیے۔ میری جان آپ میں بند ہے میں... میں چاہ کر بھی نہیں کر سکتا تھا پاپا... آئی ایم سوری۔"
اس کا سر اور نظریں جھک گئیں۔
"کوئی بات نہیں... آئی انڈر اسٹینڈ۔" حبیب نے ایک بار پھر بازو وا کر دیے اور وہ اس کے سینے سے آن لگا۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ دوبارہ کھلا اس وقت اس میں جس ہستی نے قدم رکھا اس نے حبیب کو صرف حیرت نہیں بلکہ ناگواری اور تنفر کی پستیوں میں دھکیل دیا۔

حبیب کے چہرے پر ڈزنی کو دیکھ کر جو ناگواری پھیلی تھی اس سے ولید اور خود ڈزنی بھی ایک دوسرے سے بری طرح شرمندہ ہو گئے تھے۔

"میں چلی جاؤں گی واپس۔ تمہاری زندگی میں مزید دخل اندازی کیے بغیر۔ فی الحال تم میری بات سن لو۔ میں تمہارے ہی کام سے آئی ہوں۔" وہ اپنا ہینڈ بیگ کھولتی ہوئی آکر بیڈ کی نزدیکی بنچ پر بیٹھ گئی۔ ولید بھی حبیب کے برابر سے اٹھ کر ڈزنی کے برابر میں جا بیٹھا۔ اس نے اپنا بیگ کھول کر ایک فائل نکالی۔

"تمہارے منیجر نے یہ کچھ کاغذات بھجوائے ہیں میرے ہاتھ۔ اس میں تمہارے فلیٹ کے پیپرز بھی ہیں اور دو ایک کچھ اور اہم ڈاکومنٹس بھی ہیں۔" حبیب نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات سننے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے فائل بڑھائی حبیب نے ہاتھ بڑھا کر تھامی اور اس کے ورق الٹنے لگا۔

"جب تمہارے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی تو منیجر کے لیے کلائنٹس کو مطمئن کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی لیے تمہارے وہاں بزنس کی ساکھ اور تمہارے نام پر بہت برا اثر پڑا۔ اس لیے تمہارے منیجر نے' تمہارے بہنوئی کے مشورے پر ہی سب کچھ از خود وائنڈ اپ کر کے تمہارے بزنس میں لگا سارا پیسہ بینک میں جمع کروانے کی نیت سے یہ ڈاکومنٹس پاکستان بھجوائے تھے۔ تمہارے کومے میں چلے جانے کی خبر سن کر تو ویسے بھی سب کی امیدیں ہی ختم ہو گئی تھیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم فوراً" ہی کومے سے باہر آ گئے۔" وہ بے حد ٹھہر ٹھہر کر بہت ہموار آواز میں بات کر رہی تھی۔ اس کی رواں اور شستہ انگریزی ملی ٹوٹی پھوٹی اردو سمجھنے میں حبیب کو تو نہیں البتہ ولید کو کافی مشکل پیش آرہی تھی۔

"ان میں تمہارے کچھ کلائنٹس پارٹیز کے ساتھ نیکسٹ ایئر کے کانٹریکٹ پیپرز بھی ہیں اور تمہارے فلیٹ کی ملکیت کے بھی۔۔۔ تم نے پاور آف اٹارنی اپنے بعد اپنے بیٹے ولید کو سونپ رکھا تھا لیکن ولید ابھی اٹھارہ سال کا نہیں۔ اس لیے انہوں نے میرے ہاتھ صادق بھائی کے پاس پاکستان بھجوائے تھے۔ صادق تمہارے۔۔۔ برادر ان لاء۔۔۔ مگر اب تم خود سب معاملات دیکھ لو۔۔۔ اور آگے فیصلہ کر لو۔۔۔ اگر پاکستان میں رہنا چاہو تب بھی اور اگر واپس جانا چاہو تب بھی۔۔۔" ولید اس دوران خاموشی سے سب سنتا رہا۔ حبیب نے تھوڑی دیر ان کاغذات کا مطالعہ کیا پھر فائل بند کر کے انگوٹھے اور انگلی سے اپنی بند آنکھوں کو مسلنے لگا۔

"ابھی آپ کے پاس فیصلہ کرنے کے لیے ٹائم ہے پاپا۔ پلیز۔ آپ اسٹریس مت لیں۔" ولید بے ساختہ بول اٹھا۔ ڈزنی نے اس کا بے تاب انداز دیکھا پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے۔ ولید تو تمہارے پاس رکے گا' لیکن میری یہاں موجودگی کوئی پرابلم بھی کری ایٹ کر سکتی ہے۔۔۔ تمہیں دیکھنے اور یہ کام کرنے آئی تھی۔ تمہیں سروائیو کرتے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ گڈ بائے۔" اس نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا۔ پلٹ کر پیار سے ولید کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر انہیں بہت دھیرے سے بکھیر دیا۔ پھر حبیب کو دیکھے بغیر باہر آ گئی۔ اسپتال کے لان میں صادق بھائی اپنے بچوں کے ساتھ مل گئے۔ واپسی کے سفر میں وہ بالکل اکیلی تھی۔ کھڑکی سے باہر دوڑتے بھاگتے منظروں پر نگاہیں دوڑاتی وہ حبیب کی زندگی میں اپنی دوبارہ آمد کا مقصد سوچتی رہی تھی۔ شاید اسے اسی کام کے لیے اس کی زندگی میں آنا تھا۔ اور بس۔۔۔ ماں۔۔۔ باپ اور بیٹے کی اس تکون کا ہر کونا ٹوٹا ہوا تھا۔ محبت کا بھی۔۔۔ رشتے کا بھی اور شاید احساس کا بھی۔ اس نے دھیرے سے اپنی نم آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

☆ ☆ ☆

ذرا سی دیر میں اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ واش روم سے نکل کر بیڈ تک چل کر آنے کے بعد وہ سیدھی لیٹ گئی۔ حلق میں ابھی تک کھنچاؤ سے درد ہو رہا تھا اور آنتیں یوں لگتا تھا باہر ہی آگریں گی۔

گو کہ وہ اس کیفیت سے پہلے بھی گزری تھی۔ لیکن ہر بار کمزوری کا احساس سوا ہی ہوتا ہے۔ لیکن ایک احساس اور بھی تھا۔ جو کمزوری پر پوری طرح غالب تھا۔ اور وہ تھا خوشی کا احساس' جس کے زیر اثر اس کے لب' ناتوانی میں بھی دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔

اس نے کمرے میں داخل ہوتے انس کو دیکھا۔ جس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل اور گلاس تھا۔

وہ خاموشی سے اس کے نزدیک بیٹھ کر گلاس میں پانی ڈالنے لگا۔ گلاس بھر کے سوہا کو دیتے سے اس نے سوہا کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور بے ساختہ نظریں چرالیں۔ سوہا اس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی اور الجھن محسوس کر چکی تھی۔ اس لیے کچھ کھٹک سی گئی۔

"کیا ہوا کیا سوچ رہے ہیں۔"

"وامٹ کیوں ہوئی ہے تمہیں۔ تم نے کچھ ایسا ویسا کھایا تھا کیا۔" سوہا کا منہ کھل گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی انس نے جان بوجھ کر تجاہل برتا ہے۔

"میرا خیال ہے ہم دو سے تین ہونے جا رہے ہیں۔" اس کے انداز میں شوخی تھی۔ انس نے مسکرا کر دھیرے سے دائیں ہاتھ سے اس کا گال تھپتھپایا۔ لیکن اس ردعمل میں جو زبردستی کا عنصر پوشیدہ تھا وہ اس کی نگاہوں سے مخفی نہ رہ سکا۔

"کیا بات ہے' آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔"

وہ تعجب سے دور ہٹی۔ پھر بولتے ہوئے اس کی داہنی طرف ہی بیڈ کے کنارے پر سر رکھ کر ترچھی لیٹ گئی۔ انس کا چہرہ اب سیدھا اس کی نگاہوں کی زد میں تھا۔

"نہیں خوشی تو ہوئی ہے لیکن..." اس کا لہجہ خود اس کی بات کی نفی کر رہا تھا۔

"انس!... آپ خرچے کی وجہ سے پریشان ہیں۔" اس نے انس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔ انس کی خاموشی جواب دے رہی تھی۔

"آنے والا تو اپنا رزق ساتھ لے کر آتا ہے۔"

"سوہا!... میرا خیال ہے اس سلسلے کو فی الحال یہیں روک دو تو اچھا ہے۔" اس نے نظریں ملائے بغیر سوہا کی سانس روک دی۔

سوہا اس کا مطلب سمجھنے پر جتنی تیزی سے اٹھ کر بیٹھی تھی۔ وہ اتنی ہی تیزی سے باہر نکل گیا۔

سوہا منہ کھولے ہکا بکا سی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"ارے ماہا تم اس وقت!"

کچن میں عفت اور نائلہ ہی تھیں۔ ماہا کا اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ دونوں رات دیر تک جاگنے کا پروگرام بنا بیٹھی تھیں۔ یقیناً" دونوں کو اتنے دن کی جمع کی ہوئی باتیں ایک دوسرے سے شیئر کرنی تھیں۔ ماہا کو سوہا کی کمی ایک دم بہت کھلی۔

"چائے پیو گی۔ میں اپنے اور نائلہ کے لیے بنا رہی ہوں۔"

"رہنے دو تم تو شاید بنا چکی ہو۔" وہ پھیکے پن سے مسکرائی۔
"نہیں اس میں کون سی مشقت لگتی ہے۔" عفت کے بجائے نائلہ نے کہتے ہوئے کیتلی میں پانی انڈیلا عفت دوبارہ سے پتی ڈالنے لگی۔
"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔" وہ یونہی بے خیالی میں ایک ہاتھ چوکھٹ پر رکھے عفت کو دیکھ رہی تھی۔ جب نائلہ کے پوچھنے پر عفت بھی چونک کر اسے دیکھنے لگی اور وہ خود بھی کسی گہرے خیال سے باہر آئی۔
"چلو اندر چل کر بیٹھو یہاں گرمی بہت ہے۔" اسے جواب دینے کی الجھن میں پڑتے دیکھ کر نائلہ نے خود ہی بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بنا کچھ کہے پلٹ کر عفت اور نائلہ کے کمرے کی طرف آ گئی۔
"اور سناؤ حسیب بھائی کی طبیعت تو بہتر ہے نا اب۔"
"ہاں وہ ٹھیک تو ہیں الحمدللہ لیکن۔۔۔ صادق بھائی نے مجھے گھر بھیج کر اچھا نہیں کیا۔" اسے نائلہ کے پوچھنے پر ہی ایک دم یاد آیا کہ وہ کیوں اپ سیٹ تھی۔
"کیوں۔" نائلہ نے اسے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے دیکھ کر قریب رکھا ہوا تکیہ اٹھا کر اسے دیا۔
"کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ خود وہاں رک جائیں گے لیکن' وہ خود بھی گھر چلے گئے۔"
"تو کیا وہ وہاں اکیلے ہیں۔"
"نہیں وہ بتا رہے تھے ان کا کوئی کولیگ یا دوست آیا ہوا ہے دبئی سے ملنے وہ' رک گیا ان کے پاس۔" ماہا پوری تفصیل سناتے ہوئے بھی الجھی ہوئی تھی۔
"اور میں سوچ رہی ہوں کہ ان کا ایسا کون سا دوست ہے' جسے میں نہیں جانتی یا۔۔۔ وہ اتنا قریبی کب سے ہو گیا کہ ملنے آئے اور تیمارداری کو رک جائے۔" عفت نے چائے کی ٹرے لاتے ہوئے اس کی بات سنی۔
"اس میں پریشانی والی کیا بات ہے۔ جو بھی ہو گا۔ ان کا اپنا ہی ہو گا۔" اس نے تو بہت سرسری انداز میں ایک بات کی تھی۔ اس چیز سے بے خبر کہ وہ بات جا کے سوئی کی طرح ماہا کے دل میں چبھ گئی۔
"سنو!" نائلہ کسی دھیان سے چونک اٹھی۔
"ایسا تو نہیں کہ ان کا وہ بیٹا آ گیا ہو پاکستان جو۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ماہا کی نظریں چائے کے کپ میں گڑ گئیں۔ اب یہ بات کس طرح زبان زد عام ہو چکی تھی۔ کیا اس نے کبھی سوچا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے کردار کے حوالے سے اس طرح سب سے سنتی پھرے گی۔
دوسری طرف عفت کی کہنی کے ٹھوکے نے نائلہ کو احساس دلا دیا تھا کہ وہ کیا بات کرنے جا رہی تھی۔
نائلہ خاموش تو ہو گئی لیکن اس کا مقصد کوئی برا نہیں تھا۔ اس لیے اسے محسوس بھی نہیں ہوا۔ ماہا کی البتہ مضطرب حالت میں کچھ اور سنگینی در آئی۔ نائلہ کی تو فطرت اور سوچ میں ٹوہ اور کھوج کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس لیے اس کے منہ سے نکل گیا لیکن ماہا جانتی تھی یہ بات سچ بھی ہو سکتی تھی۔
"سنو! تم پریشان کیوں ہو۔ صرف اس وجہ سے۔" عفت نے ہمدردی سے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔
"اگر نائلہ کی بات سچ بھی ہوئی تو کیا فرق پڑتا ہے۔" عفت نے انجانے میں ہمدردی کی غلیل میں رکھ کر اسے پتھر کھینچ مارا۔ ماہا نے تڑپ کر اسے دیکھا۔
"کیوں فرق نہیں پڑتا عفت! کسی کے کردار پر لگا داغ اسے چھپانا چاہیے یا پوری دنیا کے سامنے لے کر کھلے عام پھر کر سب کو باتیں بنانے کا موقع دینا چاہیے۔" نائلہ اور عفت اس کی بات سن کر اپنی اپنی جگہ چور سی بن گئیں۔
نائلہ کو تو خیر کیا کچھ یاد نہ آیا۔ لیکن عفت کوئی بات نہ ہوتے ہوئے بھی بے اختیار حدید کو یاد کر کے رہ گئی۔ پھر

ایک محتاط اچٹتی نگاہ نائلہ پر ڈالی۔ لیکن نائلہ خود بہت دور سے واپس پلٹی تھی۔ جبھی لہجے کو زبردستی بشاش بنا کر بولی۔

"دفع کرو سارے جھمیلوں کو۔ آج ہم یہ باتیں کرنے نہیں بیٹھے۔ اتنی مشکل سے فرصت ملی ہے۔ کوئی اور بات کرو بے فکری کی' خوشی کی۔۔۔ رہا ان کا سوال تو کل صبح جا کر خود دیکھ لینا کون آیا ہے ملنے۔"

نائلہ بے تکلفی سے بولتی ہوئی پیچھے سرک کر چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ اور ماہا نے پہلی بار اس کے کھلے ہوئے وجود پر نظریں دوڑا کر جھلکتی ہوئی بے فکری کو جانچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہے۔" بے حد سست رفتاری سے کپڑے پریس کرنے کے بعد شرٹ اٹھا کر انس کو دیتے ہوئے اس نے دھیرے سے استفسار کیا۔

"ہاں بہت ضروری ہے۔" وہ ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھا سنجیدگی سے ٹی وی دیکھتا رہا۔ سوہا تھوڑی دیر اس کی طرف شرٹ بڑھا کے کھڑی رہی۔ جب اس نے سوہا کی طرف نہیں دیکھا تو پھر 'مجبوراً' قریب رکھے صوفے پر ڈال دی۔

"میری طبیعت ٹھیک ہے اب۔" وہ جانتی تھی وہ کتنا بودا بہانہ تراش رہی ہے۔

"مجھے مت بتاؤ' مجھے پتا ہے۔" اس سے بحث بیکار تھی۔

مردوں کے اندر دنیا جہان سے زیادہ نثار ہو جانے کے بعد سارے عالم سے بے پروا و بے نیاز بن جانے کی ادا عورت کو کتنا جلاتی ہے۔ شاید مردوں کو اچھی طرح سے اس کا علم ہوتا ہے۔ یہی ان کا وہ ہتھیار ہوتا ہے۔ جس سے وہ عورت کے دل کا شکار کرتے ہیں اور کبھی اس کے اعصاب اور اس کی روح کو گھائل کرتے ہیں۔ سوہا گہری سانس بھر کر تیار ہونے چل دی۔

ڈاکٹر کے کلینک پہنچ کر اپنی باری آنے تک اس کا یہ حال تھا کہ آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

ہر بار وہ بے اختیار آنکھیں مسلنے کے بعد انس کی طرف دیکھتی اور وہ بے نیاز سا بن جاتا۔

ڈاکٹر نے اس کے ٹیسٹ کیے اور چیک کرنے کے بعد کہا۔

"علامات تو پریگننسی کی ہی تھیں' لیکن آپ پریگننٹ نہیں ہیں۔"

"آپ کو پورا یقین ہے کہ میں پریگننٹ نہیں ہوں۔" سوہا نے چونک کر ڈاکٹر کو دیکھا اور پوچھا۔

"کتنا عرصہ ہو گیا شادی کو" اس نے شفقت سے سوہا کا کمزور ہاتھ اپنے ہاتھ سے دبایا۔ سوہا کا ہاتھ تو بالکل سرد ہو رہا تھا۔

"دو سال۔۔۔ یا اس سے کچھ کم۔" "میں شادی کے بعد پریگننٹ ہوئی تھی پھر میرے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا اور ۔۔۔ اور میرا بچہ بچ نہیں سکا۔"

"آپ بالکل ٹینشن مت لیں۔ اگر کوئی تشویش یا پریشانی کی بات ہوتی۔ تو آپ کی ڈاکٹر' آپ کو اسی وقت بتا دیتی۔ لیکن' خیر میں آپ کی تسلی کے لیے ایک دو ٹیسٹ لکھ دیتی ہوں۔ یہ کروا لیں' لیکن طبیعت سنبھلنے کے بعد او کے۔۔۔"

اٹھنے سے پہلے آخری بار ڈاکٹر کے چہرے پر چمکنے والی حوصلہ افزا مسکراہٹ نے اسے کافی تسلی دی تھی۔ لیکن یہ تسلی اسی شام کافور ہو گئی۔

"چھوڑو بھئی۔ جس کام میں ابھی ہاتھ نہیں ڈالنا۔ اس پر خرچ کر کے کیا کرنا۔" انس نے لاپرواہی سے پرسکرپشن ایک طرف ڈال دی۔
سوہا کے اندر جو تھوڑا بہت جوش و جذبہ ابھرا تھا۔ وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی اس طویل عرصے کی بیروزگاری میں تنگی معاش کے دن آن لگے تھے اور دوسری نوکری کا اب تک کوئی بندوبست نہیں ہو سکا تھا۔
"اف اللہ" اسے بے حد تنگی اور گھٹن کا سا احساس ہونے لگا۔

☼ ☼ ☼

صادق صبح صبح ہسپتال جانے کو تیار تھے انہیں پہلے ماہا کو پک کرنا تھا پھر اسے ساتھ لے کر ہاسپٹل جانا تھا۔ انہوں نے یہ سوچ کر ماہا کو کال کی تھی کہ فون رضوانہ حسن نے اٹھایا۔
"ماہا تو صبح ہی نکل گئی تھی ہسپتال کے لیے۔"
رضوانہ کے مطمئن لہجے میں دی جانے والی خبران کے ہاتھوں کے چڑیاں طوطے سب اڑانے کے لیے کافی تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی ولید کو کال کی۔
"ولید بیٹا میں بات کر رہا ہوں صادق 'ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔"
"کیسی گڑبڑ انکل؟" حبیب کو ناشتا کرواتے ہوئے کال لینے والا ولید بے فکری ترک کر کے ایک دم چوکنا ہو گیا۔ دوسری طرف صادق اسے جو کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ دل نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ماننا ہی تھا کیونکہ بہرالحال فی الحال سب کی بہتری اور بھلائی اسی میں تھی۔
"ٹھیک ہے میں فوراً" نکلتا ہوں۔"
اس کی سمجھ داری نے ایک بار پھر صادق کے دل میں اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات جگا دیے۔
دوسری طرف حبیب کو اپنی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہوا پا کر' اس نے مختصراً" سب احوال سنایا اور تیزی سے اپنا والٹ موبائل وغیرہ بیگ میں ڈال کر الوداعی بوسہ دینے کے لیے حبیب کی بانہوں میں سما گیا۔
"بس کچھ ہی دن کی بات ہے بیٹا! پھر یہ دوریاں ہمارے درمیان سے ختم ہو جائیں گی۔ ایک بار میں گھر آ جاؤں پھر تم بھی میرے پاس میرے ساتھ میرے گھر میں رہو گے۔" اس نے ہاتھوں کے پیالے میں اس کا نو عمر چہرہ تھام کر محبت سے پیشانی پر بوسہ دیا۔
"آئی انڈر اسٹینڈ پاپا! سب کچھ ڈس کلوز ہو جائے گا' ہونا ہی ہے۔ بٹ ہسپتال از ناٹ آ سوٹ ایبل پلیس فار انی اہنہنگیہ" (ہسپتال کسی بھی مسئلے یا معاملے کے لیے مناسب جگہ نہیں ہے۔)
اس کے تسلی آمیز انداز نے حبیب کے دل میں دور تک اجالا سا بکھیر دیا۔
"دیر ہو رہی ہے چلتا ہوں۔" وہ سلام کرتا تیزی سے باہر نکل گیا۔
گمان غالب تھا کہ اگر ماہا کو گھر سے نکلے ہوئے دیر ہو چکی ہے۔ تو وہ یقیناً" پہنچنے ہی والی ہو گی اور وہ اس کے یہاں آنے سے پہلے پہلے' اس جگہ سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ تب ہی اپنی دھن میں تیز تیز قدم بڑھاتا کاریڈور میں کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔
"اوہ! آئی ایم رئیلی سوری میم۔" اس نے بدلی زبان و انداز میں فوراً" معذرت کی۔ کیونکہ وہ لڑکی جو کوئی بھی تھی' یقیناً" اس کی اپنی بے دھیانی اور عجلت پسندی کا شکار ہوئی تھی۔
"اٹس اوکے۔" ماہا نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کر اجنبی کو راستہ دیا اور تیزی سے دوسری طرف مڑ گئی۔ اسی کی طرح قدرے تیز رفتاری سے قدم بڑھاتا ولید ہسپتال کی عمارت دور جاتا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں حسیب کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔
اندر داخل ہونے ' اس سے ملنے اور پھر ہاتھ میں تھاما سامان رکھنے تک اس کا انداز ایسا تھا جیسے ' وہ کسی کو تلاش کر رہی ہو۔
"کیا بات ہے۔ کیا ڈھونڈ رہی ہو۔" حسیب جانتا تو تھا لیکن پھر بھی کبھی کبھی کسی بات کو جانتے بوجھتے کریدنے کا بھی اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔

"وہ یہاں...." وہ رکی چونکی اور پھر دو لفظ بول کر الجھ سی گئی۔
"یہاں کیا۔"
"رات آپ کے پاس کون ٹھہرا تھا۔"
وہ بغور حسیب کا چہرہ دیکھتی ہوئی اس کے بالکل نزدیک آگئی۔ جو دو حرفی سوال آدھے سانس لے کر اس کے لبوں پر دم توڑ گیا تھا۔ اب وہ مکمل ہو کر آنکھوں میں آن بیٹھا تھا۔
"تھا کوئی.... تم کیوں پوچھ رہی ہو۔"
"کون تھا آخر.... میں پوچھ نہیں سکتی کیا۔ کیسے کسی انجان شخص پر بھروسہ کر کے صادق بھائی آپ کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔"
"نہ میں اکیلا تھا۔ نہ وہ انجان۔" اس نے چہرہ موڑ کر دوسری طرف دھیان لگانا چاہا اور ماہا اس کے اس انداز پر مزید ٹھٹک گئی۔ اس نے ہاتھ سے حسیب کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔
"آپ اور صادق بھائی۔ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔"
چند لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔
کتنی عجیب سی بات تھی۔ اگر وہ کچھ چھپا رہے تھے تب بھی ' ماہا کو معلوم تھا کہ وہ کیا چھپا رہے ہیں اور حسیب جانتا تھا کہ ماہا کے دل میں شک اپنی جڑیں پکڑ چکا ہے۔ جب وہ یہاں تک پہنچ سکتی ہے کہ تھیلے میں کچھ ہے۔ تو کیا یہ نہیں جان سکتی تھی کہ اس کے اندر کچھ اور نہیں بلی ہے۔ جو کسی بھی وقت باہر آسکتی ہے۔
حسیب نے بغور دیکھا۔ اس کے کمزور چہرے پر سرخی کی جگہ زردی آگئی تھی۔ جسامت پہلے ہی دبلی تھی۔ اب کمزور ہو چلی تھی۔ اس کی جدائی اور جدائی کے واہموں نے ماہا کو آدھا بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اور اب وہ پھر ایک واہمہ لے کر سامنے کھڑی تھی۔
"جیسا تم سوچ رہی ہو۔ ویسا کچھ بھی نہیں ہے ماہا۔" اس نے بمشکل دل کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کیا۔ ماہا نے نظریں چرا لیں۔
"تم نے صادق بھائی سے وہ بات کی جو میں نے تم سے کرنے کے لیے کہا تھا۔" ابھی وہ مڑ کر بیٹھ بھی نہیں سکی تھی کہ حسیب نے ایک بار پھر اسے مضطرب کر دیا۔
"صادق بھائی...." وہ نظریں جھکا کر یہاں وہاں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ جب صادق نے کمرے کا دروازہ کھولتے وقت اس کی آواز سنی۔
"وہ کہہ رہے تھے کہ وہاں آپ کے ایکسیڈنٹ کی خبر دے دی گئی ہے۔ کوئی مناسب سمجھے گا تو رابطہ کر لے گا۔"
صادق نے اندر آکر سلام کیا۔ ماہا اپنے جھوٹ سے گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اسے اندازہ کرنے میں دشواری ہو رہی

تھی کہ صادق نے اس کی کتنی بات سنی ہے۔
حسیب کو دل ہی دل میں ماہا کے جھوٹ پر افسوس ہوا۔ صادق ' ماہا اور وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس وقت وہ تینوں ایک بات کو جانتے بوجھتے ایک دوسرے سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ حسیب کا دل اچانک ہی اکتا گیا۔
"صادق بھائی۔ یہ سب کب تک چلے گا۔" اس نے ایک دم ہی فیصلہ کرلیا۔ آر یا پار.... یہ آنکھ مچولی۔ چوہا بلی کب تک۔ کبھی تو سچائی سامنے آنا ہی تھی۔
"کیا.... کس کے بارے میں بات کررہے ہو۔" وہ ایک دم بوکھلا گئے۔
"ہم تینوں جانتے ہیں کہ میں کس بارے میں بات کررہا ہوں۔ آپ نے ماہا کو بتایا کیوں نہیں کہ آپ ولید کو پاکستان بلوا چکے ہیں۔"
صادق اور ماہا۔ ہکابکا رہ گئے۔ زمین دونوں کے قدموں تلے سے سرکی تھی لیکن الگ الگ انداز میں اور جب صادق سنبھلے تو ان کا جی چاہا کہ بڑھ کر حسیب کے منہ پر کم سے کم تھپڑ تو رسید کر ہی دیں۔
انہیں ایک نہیں دو باتوں پر غصہ چڑھا تھا۔ ایک تو اس کے یوں بے وقت بھانڈا پھوڑنے پر۔ دوسرے ان کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانے پر۔
دوسری طرف ماہا نے شاک سے باہر آکر جس طرح انہیں گھورا۔ وہ انداز ' انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی چور بنا گیا۔ اس نے باری باری دونوں کی شکلیں دیکھیں اور پھر شدید غصے میں پیر پٹختی باہر نکل گئی۔
"ماہا.... ماہا بیٹے رکو تو سہی...." انہوں نے اسے روکنے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اس کے باہر نکلنے کے بعد جھلا کر حسیب کی طرف پلٹے۔
"کیا ضرورت تھی یہ بکواس کرنے کی۔" اب ان کا مزید مروت دکھانے کا قطعی موڈ نہیں تھا۔
"ابھی نہیں تو کبھی نہ کبھی تو یہ بکواس کرنی ہی تھی۔"
"تو تم نے اس کبھی نہ کبھی کے لیے لوگوں سے بھرے ہسپتال کا انتخاب کرلیا۔ چند دنوں میں تمہاری چھٹی ہو جاتی۔ اس کے بعد بھی تو معاملات سنبھالے جاسکتے تھے۔ تم جانتے نہیں ہو۔ مزنہ اور ماہا کے درمیان کس قدر کشیدگی ہے۔ اگر مزنہ مزاج کی تیز ہے تو تمہاری بیوی نے بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اب وہ پتا نہیں وہ کس طرح ری ایکٹ کرے گی۔"
انہیں حقیقتاً" اپنے اعصاب شکستہ ہوتے محسوس ہونے لگے۔ حسیب بے شک ابھی بیمار تھا۔ چلنے پھرنے سے مجبور تھا۔ لیکن کچھ تو اسے بھی صادق کی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیے تھا۔
"آپ پریشان مت ہوں صادق بھائی۔ میں سنبھال لوں گا۔" اس کا دل صادق کو یوں حواس باختہ سا دیکھ کر حقیقت میں نادم ہو گیا۔ اپنے تئیں اس نے کمرے میں بے قراری سے یہاں وہاں پھرتے صادق کو تسلی دینی چاہی تھی۔ لیکن وہ اور بھی بھڑک گئے۔
"رہنے دو میاں تم.... ایک ذرا سی بات تم سے سنبھالی نہیں گئی۔ اور ایک میں ہوں۔ کل رات سے وہ میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے جاہل عورتوں کی طرح جیسے میں نے تمہیں یعنی کسی ننھے منے بچے کو اکیلا بھرے بازار میں چھوڑ دیا ہو۔"
ان کے غصے کا گراف بتدریج اوپر کی طرف سفر کررہا تھا۔ اور ان کی گفتگو بدلتے ہوئے رنگ سے صاف واضح تھا۔
"ایک میں گدھا ہوں کہ جھوٹ پر جھوٹ ' جھوٹ پر جھوٹ بولے جارہا ہوں۔ کیوں کس لیے.... ایسے جھوٹا بننے کے لیے ہی تو.... بس میاں بہت ہوئی۔ اچھی خاصی سچویشن کو تم نے خود ہی بھاڑ میں جھونکا۔ اب اس کٹ

کھنی بلی کو بھی خود ہی سنبھال لینا میں تو چلا۔" وہ بالکل ہی ہتھے سے اکھڑ گئے۔
"ارے ارے صادق بھائی پلیز میری بات تو سنیں۔" اسے اپنی بے بسی کا پوری طرح اندازہ ہو رہا تھا اور اپنی غلطی کا بھی۔ لیکن صادق بھائی اب کسی کی سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔
باہر لان میں بینچ پر بیٹھی ماہا نے انہیں تن فن کرتے باہر جاتے دیکھا اور سر جھٹک کر آنسو صاف کرنے لگی۔

✲ ✲ ✲

چڑھتے ہوئے دن کی تپش درختوں کی چھاؤں میں بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ وہاں بیٹھی خود سے اور اپنی سوچوں سے الجھتی ہار ہی گئی۔ کب تک یوں اکیلی بیٹھی رہتی اور کب تک جھگڑتی۔ خود سے الجھتی انہی سوچوں سے اور کڑھتی اپنے ہی خیالات پر۔
ولید۔۔۔ حبیب کا حقیقی بیٹا پاکستان آچکا تھا۔ اور اسے کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی۔ اس سے کیا ثابت ہوتا تھا۔ کم از کم دو باتیں تو بہت واضح۔۔۔ اس کی اپنی اہمیت اور حیثیت نہ صرف حبیب بلکہ اس سے جڑے دوسرے لوگوں کی نظر میں۔ اور دوسرے اس لڑکے کی اہمیت و حیثیت وہ بھی نہ صرف حبیب بلکہ اوروں کی نظر میں بھی۔
یعنی اتنا کچھ ہو جانے کے بعد 'اتنا ہجر' اتنی دوری تنہائی۔ موت جیسا عذاب ناک خوف جھیلنے کے بعد بھی حبیب نے بالآخر کی تو اپنے من کی ہی۔۔۔
"پھر میری۔۔۔ میری اور میری بات کی بھلا اہمیت ہی کیا ہے۔ اور میں کیوں فضول میں اپنا دل جلا رہی ہوں جب' کسی کو پروا ہی نہیں۔ میں اس شخص سے ناراض ہو کے یہاں بیٹھی ہوں۔ جس کو میری متوقع ناراضی کا پورا علم تھا۔ پھر بھی اس نے وہی کیا جو' اس نے چاہا۔ تو پھر میں وہ کیوں نہ کروں جو میں چاہوں۔۔۔ اور میں۔۔۔" وہ بے خیالی میں درختوں کی شاخوں پر پھدکتے پرندوں کو دیکھتی سوچے گئی۔
"میں بھلا چاہتی کیا ہوں۔۔۔ سوائے حبیب کے۔۔۔ اگر انہیں میری زندگی سے نکال دیا جائے تو بچے گا کیا میرے پاس۔۔۔"
قریب بنی ہوئی گیلی کیاری میں دو چڑیاں گھاس کے ایک سوکھے تنکے پر آپس میں چونچیں مار رہی تھیں۔
"اور کیا ولید اکیلا ہی پاکستان آیا ہے یا پھر۔۔۔" ایک سوچ نے کسی زہریلے بچھو کی طرح بے حد آہستگی سے اپنا زہر اس کی رگ میں پیوست کیا۔
"اگر یہ معمولی سا پرندہ اپنے گھونسلے کے لیے اتنی جدوجہد کرتا ہے۔ تو کیا میں اس ننھی چڑیا سے بھی گئی گزری ہوں۔ اس سے بھی زیادہ بے بس ہوں کہ وہ عورت اور اس کا بچہ میرے شوہر پر قبضہ کر کے میرا گھر اجاڑ کر' میرا دل اور دنیا ویران کر کے اتنی خاموشی سے حبیب کو اپنا بنا لیں اور میں دیکھتی رہوں۔ کچھ نہ کروں۔ کچھ نہ کہوں۔"
اس نے گہری سانس لے کر خود اور اپنی یہاں وہاں بکھری سوچوں کو سمیٹا' یکجا کیا اور خاموش لیکن بے حد مضبوط قدموں سے ہسپتال کے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگی۔
اسے یقین تھا کہ حبیب اس کا منتظر ہو گا اور یہ یقین اتنا بھی غلط نہیں تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی اور بنا کچھ کہے ایک جانب بیٹھ گئی۔
حبیب نے اسے اندر آکر یوں خاموشی سے بنا سوال جواب کیے ایک طرف بیٹھتے دیکھا۔ لیکن مخاطب کرنے کی غلطی نہیں کی۔
اس کی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں' ٹانگ پر رکھی ٹانگ کے ہلتے ہوئے پنجے موبائل کے تیزی سے دباتے ہوئے بٹنوں والے ہاتھوں کی لرزش' قدرے تیز تنفس اس بات کا گواہ تھا۔ کہ اس وقت اس کی حالت اس بھاپ بھرے

برتن کی مانند ہو رہی ہے۔ جو ذرا سی جنبش سے بال برابر جگہ ملنے پر پھٹ پڑے گا۔

حسیب اس کی کیفیت اور اس کا اعتبار دوسری بار ٹوٹ جانے پر اس کی حالت سمجھ رہا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اسے چھیڑا نہ جائے۔ کھولتے ہوئے برتن کا ڈھکن ہٹا کر جلتی بھاپ سے خود کو جلانے سے بہتر تھا کہ اس کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کر لیا جائے۔

وہ کافی دیر بلکہ نجانے کتنے گھنٹے یونہی کبھی سیل کبھی کھڑکی اور کبھی یہاں تو کبھی وہاں کو اپنی توجہ سے نوازتی رہی۔ پھر مغرب کی نماز پڑھ کر واپس آئی تو اپنا بیگ اٹھا لیا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" حسیب اسے واپسی کے لیے تیار دیکھ کر بے اختیار مخاطب کرنے پر مجبور ہو گیا۔

"گھر واپس۔۔۔"

"لیکن کیوں؟" صبح کی بہ نسبت وہ اس وقت تک کافی پرسکون ہو چکی تھی۔

"کیوں مطلب! کل بھی تو چلی گئی تھی۔"

"اور میں یہاں اکیلا۔۔۔" اس کی بات پر اس نے ایک زخمی نظر اس پر ڈالی اور رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

"میں نے ڈاکٹرز سے بات کی ہے۔ اگلے ہفتے آپ کو چھٹی مل جائے گی۔ میں آجاؤں گی اس دن۔"

"کس دن؟" وہ حیرت سے سنتے چونک۔

"جس دن آپ ڈس چارج ہوں گے۔"

"اور اس سے پہلے۔۔۔" ماہا نے جواب نہیں دیا۔

"ذرا مجھے ایک سیب تو دے دو۔ کھانے کا دل کر رہا ہے۔" وہ جھک کر بیگ اٹھاتے ہوئے رک گئی۔ پھر پلیٹ میں چھری اور سیب رکھ کر اس کی گود میں رکھ دیا۔

"اپنے بیٹے کو کال کر دیں۔ وہ آجائے گا۔ آپ اکیلے بھی نہیں رہیں گے اور میری کمی بھی محسوس نہیں ہو گی۔" اس نے بیگ اٹھا کر شانے پر ڈالا۔ اور پلٹ کر ایک نظر حسیب پر ڈالی۔

"چلی جاؤ اگر جانا چاہتی ہو۔ لیکن کل ضرور آجانا۔ کیا پتا زخم ایک بار پھر ہرے ہو جائیں اور اس بار میں جانبر نہ ہو سکوں۔" چھری کی نوک اس کی داہنی شہادت کی انگلی پر رکھی گھوم رہی تھی۔ ماہا اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کل آفس سے واپسی پر اماں کے یہاں آجایئے گا۔"

رات سونے سے پہلے سبز چائے کا کپ لے کر وہ کمرے میں آئی تو حدید کو ہوشیار باش دیکھ کر سوچا بات ہی کر لے۔

"کیوں۔ ابھی کل پرسوں تو آئی ہو رہ کر۔"

"ہاں بس۔۔۔ وہ۔۔۔ اماں کا فون آیا تھا۔ عفت کی رخصتی کے لیے جوڑے وغیرہ لینے ہیں اور باقی تیاریوں وغیرہ کے لیے بلایا ہے۔ مشورے کے لیے۔"

"تو یہ مشورہ وہ پرسوں نہیں کر سکتی تھیں۔" اس نے مصنوعی خفگی سے آنکھیں نکالیں۔ اس نے چائے کے کپ کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نائلہ جھکی کھڑی تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے چائے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور اسے جھٹکا دے کر گرانے کی کوشش کی۔ نائلہ سمجھ چکی تھی۔ جبھی اس کی شرارت پر ہنستے ہوئے خود ہی شرافت سے قریب بیٹھ گئی۔

"تم نے اپنے لیے چائے نہیں بنائی۔"

"نہیں میں نے کھانے کے بعد شام میں ہی پی لی تھی۔" حدید نے گھونٹ بھرا۔ پھر اس کی سنجیدہ شکل دیکھی جو' اب اپنے ہاتھوں کو گھور رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ کر کچھ سنجیدگی میں ڈھل گئی۔

"وہ... اماں پریشان ہیں۔ عفت کے سسرال والوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں زیور کا بھی کہہ دیا ہے اور ساس نندوں کی پہناؤنیاں وغیرہ..."

"تم نے کیا کہا ان سے۔"

"میں کیا کہتی... آپ سے بات کیے بغیر میں ان کو تسلی تو دے سکتی تھی لیکن کوئی وعدہ نہیں کر سکتی تھی۔" حدید جواباً" خاموشی سے کچھ سوچتے ہوئے چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔

"آپ کے آفس سے اگر لون وون مل جائے تو..." اس نے بے حد جھجکتے ہوئے یہ بات کی تھی۔ اپنے اور اس کے تعلقات کی لاکھ بہتری کے بعد بھی وہ اس قدر جلد خود کو اس ڈیمانڈ کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ سوچتے ہوئے اس نے نظر اٹھائی تو بس اس کی شرٹ کے گریبان پر بنے ڈیزائن ہی میں الجھ کر رہ گئی۔

"ہوں..." اس نے سوچتے ہوئے کپ خالی کر کے رکھا۔

"کرتا ہوں آفس میں بات۔"

"اگر آسانی سے ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ..."

"میں مشکل اٹھالوں گا۔" اس کا گمبھیر لہجہ خلوص کی آنچ پر تپ کر کندن سا ہوا۔ نائلہ کو تشکر کے الفاظ فالتو سے لگے۔

"تو پھر کل کا پروگرام ڈن سمجھوں۔"

"پہلے آج کا پروگرام تو کرلو ڈن۔" نائلہ نے جھینپ کر اسے دور دھکیل دیا۔

☼ ☼ ☼

اس نے خود کو وقتی طور پر حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ جانیں اور ان کی اولاد...

دل ہی دل میں کئی بار پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہ' اندر ہی اندر کھڑی تھی۔ پھر دل کے ہاتھوں زیادہ بے بس ہوتی تو' فون کر لیتی۔ دوسری جانب حسیب پوری شدت سے اسے اپنے پاس بلاتا تھا۔ اور اس کا دل جیسے سینے کی دیواروں سے لڑکھڑاتا مچل اٹھتا۔ دل میں خود سے ہزار وعدے اور سینکڑوں ارادے کرنے والی فقط تین دن بعد ہی اپنے دل سے ہار کر ہسپتال جانے کا ارادہ کر بیٹھی۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے یوں گھر میں رکتے دیکھ کر رضوانہ حسن مضطرب ہو جاتی تھیں۔ وہ ماہا کی زندگی میں آجانے والے ٹھہراؤ کو اب کسی صورت کسی تلاطم کی نظر کرنے کی حق میں نہیں تھیں۔

"تم صرف اپنی زندگی دیکھو میری بچی۔ اور ایک عورت کی زندگی مرد کے بغیر بالکل کاغذ کے پھول کی طرح ہوتی ہے۔ جس میں خوشبو تو خیر آتی ہی نہیں۔ چند گھنٹے بھی اگر دھوپ میں پڑا رہ جائے تو رنگ بھی اڑ جاتا ہے۔ پھر ایسی بے رنگ اور بغیر خوشبو کی زندگی بھلا کس کام کی۔" ماہا نے ان کے سینے سے لگا سر اٹھا کر بے تابی سے ان کا چہرہ ٹٹولا۔

"کیا آپ مجھے سمجھوتا کرنے کو کہہ رہی ہیں امی..."

"کرنا ہی پڑے گا۔ جب ظاہر ہے تم نے اپنی سی سب کر کے دیکھ لی۔ تب بھی اس کی زندگی میں دوسروں کی جگہ تم نہیں لے سکیں۔ تب سب سے آخری راستہ یہی رہ جاتا ہے نا!"

"سب سے آخری اور سب سے مشکل بھی تو۔" وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی۔
"زندگی میں سب کچھ نہ تو آسان ہوتا ہے نہ ہماری مرضی کے مطابق تو پھر جب یہ طے ہے کہ زندگی کے اس سفر کو آخر تک ہمیں نبھانا ہی ہے۔ چاہے رو کر چاہے ہنس کر تو پھر.... ہنس کر کیوں نہیں۔" انہوں نے محبت سے اس کے بالوں کا بوسہ لیا۔
"اسے تھوڑا وقت دو' اسے ایک موقع دو.... اور خود کو بھی.... پھر وقت اور حالات کو فیصلہ کرنے دو۔ اس طرح کے طرز عمل سے تم حسیب کے دل میں اپنی اہمیت کم بھی کر سکتی ہو اور خدانا خواستہ بالکل کھو بھی سکتی ہو۔" ماہا ایک دم جیسے اکتا کر اٹھی۔
"میں نیچے جاتی ہوں عفت کے پاس اس سے پوچھتی ہوں کل شاپنگ پر جانے کے لیے کیا پروگرام ہے۔" رضوانہ نے اپنی بات کے جواب میں اس کا لاتعلق سا ردعمل دیکھا۔ پھر اسے نیچے کی طرف جاتے دیکھ کر تاسف سے سوچ میں پڑ گئیں۔ جو لوگ دوسروں کی زندگیوں سے سبق نہیں سیکھتے' زندگی پھر انہیں اپنے انداز میں سبق سکھاتی ہے اور جو دل پتھر کی مانند کسی کے آنسوؤں' جذبات اور رشتوں کی نزاکتوں سے نہ پگھلیں۔ پھر انہیں ٹھوکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ٹھوکر ماہا کو بھی لگتے لگتے بچی تھی اور وہ اس پر بھی سنبھلنے کو تیار نہیں تھی۔ تو پھر اب....
"میری دعا ہے کہ خدا تمہیں کسی بھی سخت امتحان سے دور رکھے۔" بے حد بجھے ہوئے لیکن سچے دل سے ان کے لبوں نکلی دعا' پر پھیلا کر بارگاہ الٰہی قبولیت میں حاضری دینے عرش کی جانب پرواز کر گئی تھی۔
نائلہ دوسرے دن اپنے ساتھ ساتھ سوہا کو بھی رکشے میں بٹھا کر گھر لے آئی۔ عفت کے نکاح کے بعد یہ دوسرا موقع تھا جب پورے گھر میں خوشی کی ایک انوکھی سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ عفت نے اسے خوب بھینچ کر گلے لگایا۔ وہ بھی کسی جذبے کے تحت دیر تک چپکی کھڑی رہی۔
"اچھا چلو جلدی سے چادر وغیرہ لے لو عفت! میں ابا سے مل کر آتی ہوں۔"
"ابا سو رہے ہیں۔ انہیں شدید فلو کے ساتھ بخار چڑھا ہوا ہے۔ دوائی دی ہے میں نے۔" عفت کی دھیمی آواز سب سے آخر میں آئی تھی۔
"کیوں خیریت۔ اتنی گرمی میں فلو.... خیر واپسی میں آئس کریم لیتی آؤں گی۔ کھائیں گے تو ٹھیک ہو جائیں گے۔"
اپنے تئیں اس نے بڑی سمجھ داری سے حل نکالا تھا۔ ای کی ہنسی چھوٹی تو اماں نے بھی ہنس کر اس کے سر پر چپت رسید کر دی۔
"بڑی آئی ڈاکٹر۔ آئس کریم سے نزلہ ٹھیک کرے گی۔"
"ہاں اور نمک سے ہائی بلڈ پریشر۔"
ایک زبردست قہقہہ پڑا اور پھر گھر سے نکل کر شاپنگ سینٹر پہنچنے تک پورا راستہ نائلہ ان تینوں کو یقین دلاتی رہی کہ گرمی کی کھانسی اور فلو کا یہی سب سے آسان علاج ہے۔
اس کی اور عفت کی گفتگو اور نوک جھونک سے ماہا اور سوہا کے موڈ بھی بڑی حد تک بحال ہو گئے تھے۔
چاروں ایک یادگار دن گزار کر واپس لوٹی تھیں۔
نائلہ ہی کے مشورے پر عفت کے لیے ہلکے کامدار تین اور تین ہی بھاری زری دبکے اور نگوں سے بھرے ہوئے سوٹ لیے گئے تھے۔ سوہا نے برائے نام حصہ لیا۔ وہ تو بس سارا وقت نائلہ کے بیگ سے نکلتے نوٹوں کی اس گڈی کو دیکھے گئی۔ جس کی موٹائی بے شک زیادہ نہ تھی۔ لیکن اس کی موجودگی ہی سوہا کو حیرت میں ڈالنے کے لیے

کافی تھی۔ گھر واپسی پر امی اور چچی جان دونوں ہی گرما گرم چائے کے ساتھ ان تینوں کی منتظر تھیں۔ گو کہ نائلہ نے کمال مہربانی سے دوپہر کے کھانے کے ٹائم پر پھولیوں کی چاٹ اور کولڈ ڈرنک سے تینوں کی شاپنگ کا لطف بڑھا دیا تھا۔ لیکن جس وقت وہ گھر پہنچیں سہ پہر جا رہی تھی اور بھوک کا احساس پھر سے جاگنے لگا تھا۔ اسی لیے نائلہ ہی نے گھر کے قریب سے سموسے اور جلیبیاں بھی لے ڈالیں۔ عفت نے بالکل سرسری انداز میں کہا تھا کہ

"مجھے تو دوبارہ سے بھوک لگنے لگی ہے اور ٹانگیں تھک کر چور ہو چکی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ گھر جا کر اگر چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو مل جائے۔"

نائلہ نے فی الفور سموسے اور جلیبیاں خریدنے کی سوچی اور جھٹ پٹ عمل کر ڈالا۔ ماہا اور سوہا تو حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی رہ گئیں۔ کیونکہ کچھ دنوں سے نائلہ انہیں مسلسل حیران ہی کر رہی تھی۔ لیکن اس حیرانگی کو زبان دینے کی ہمت بہرحال ان دونوں میں نہیں تھی۔ لیکن عفت تو اسی کی بہن تھی۔ بے اختیار اس کی ٹھوڑی پکڑ کر ماہا کی طرف گھما کر بولی۔

"ارے بہنوں' ان آنٹی کو پہچانتی ہو۔ چہرہ بڑا جانا پہچانا سا لگتا ہے۔ ارے.... لو یہ تو اپنی نائلہ بی بی ہیں۔ پر ان کے یہ کرتوت پہلے تو سامنے نہیں آئے۔" اس نے منہ کو ہونق بنا کر سموسے اور جلیبیوں کے شاپرز کی طرف اشارہ کیا۔ قل قل کرتی ہنسی کی دھنک چاروں اور پھیل گئی۔ اپنا مذاق اڑانے والوں میں نائلہ خود بھی شامل تھی۔

☆ ☆ ☆

جیسے جیسے رخصتی کے دن نزدیک آ رہے تھے۔ عفت کے دل میں نت نئے خدشات زور پکڑتے جا رہے تھے۔ عفت معراج سے روز کی طرح بات بھی نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس میں ایک خاص وقفہ در آیا تھا۔

ایک دوبار اس نے کوشش کی کہ معراج کو ان کی والدہ کی باتوں کی بابت بتا کر ان سے دریافت کرے کہ آخر انہیں بیٹھے بٹھائے عفت میں کون سے کیڑے نظر آنے لگے۔ جو وہ دبے لفظوں میں اور کبھی کھلم کھلا اس طرح کی غلط باتیں کرنے لگیں۔ لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ الٹا ایک دوبار تو معراج نے ان باتوں کو ہواؤں میں اڑا دیا۔ پھر سنجیدگی سے لینے کی کوشش بھی کی تو عفت اور اس کے درمیان ایک عجیب طرح کی تلخ کلامی کی سی صورت حال پیدا ہو گئی۔ عفت کو معراج سے اس معاملے میں اس قدر غیر سنجیدگی کی امید نہیں تھی۔

یہ ٹھیک تھا کہ اس نے ان چند دنوں میں عفت کے ساتھ محبت کے بلند و بانگ دعوے نہیں کیے تھے۔ لیکن محبت کا اظہار تو بہرالحال کیا تھا۔ لیکن اب عفت کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ اظہار صرف وقتی کشش کے زیر اثر آجانے کی وجہ سے معراج اس سے کر بیٹھا تھا۔ اور اب ہر گزرے دن کے ساتھ جب ان کے درمیان نزدیکیاں بڑھیں تو' وہ کشش بہت تیزی سے اپنا اثر کھوتی جا رہی تھی اور یہ احساس اس وقت اور شدید ہو گیا۔ جب معراج کی کال دیر سے اٹینڈ کرنے پر وہ اس کی طرف سے کوئی ایکسکیوز سنے بغیر برا ہی مان گیا۔

"کب سے فون کر رہا ہوں.... کہاں تھیں۔"

"دوسرے کمرے میں اماں اور ابا کو کپڑے دکھا رہی تھی۔" عفت کا خیال تھا کہ اس بات پر معراج شوخی میں آجائے گا لیکن....

"اچھا۔ یہ کوئی وقت ہے کپڑے دکھانے کا اور میں جو انتظار میں سوکھ رہا تھا کب سے۔"

"بتا تو رہی ہوں کہ دوسرے کمرے میں تھی۔ فون سائیلنٹ پر تھا۔" دوسری طرف خاموشی رہی۔ پھر جب وہ بولا تو اس کے لب و لہجے میں ایک عجیب سی ناگواری کی بو تھی۔

"تمہیں خیال رکھنا چاہیے نا! کہ میں صرف تمہاری آواز سننے کے لیے اتنی رات تک جاگتا ہوں۔ مجھے صبح

آفس بھی جانا ہوتا ہے۔" عفت ایک دم چپ رہ گئی۔
"یہ بھلا کس طرح کی بات ہے۔ مجھے بھی صبح بہت سے کام ہوتے ہیں۔ میں بھی آپ ہی سے بات کرنے کی خاطر جاگتی ہوں اور۔۔۔" وہ بہت ضبط کرنے والی فطرت کی حامل تھی۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا۔
"تو احسان جتا رہی ہو مجھے۔"
"کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔ کیا آپ نے احسان جتانے کے لیے کی تھی اپنے آفس جانے کی بات۔۔۔ نہیں نا۔۔۔ میں بھی ویسے ہی کہہ رہی ہوں جیسے آپ۔۔۔" معراج نے جواب نہیں دیا۔
"اوکے۔۔۔ آئی ایم سوری۔ میں آئندہ خیال رکھوں گی کہ فون کریں تو آپ کو انتظار نہ کرنے پڑے۔۔۔ ٹھیک۔۔۔ اب جلدی سے اپنا موڈ ٹھیک کریں۔" بظاہر اس نے بڑے خوشگوار موڈ میں یہ بات کہی تھی۔ لیکن یہ صرف وہ ہی جانتی تھی کہ اس کے دل کے اندر کہیں، کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔
"اور سیل سائلنٹ کیوں تھا۔" اس کے پاس اب ایک نئی بات تھی۔
"ایسے ہی رات میں شور ہوتا ہے نا!"
"تو ہونے دو۔۔۔ میرا اور تمہارا تعلق کوئی چوروں والا تو نہیں۔ جو یوں چھپ چھپ کر اور چھپا چھپا کر بات کی جائے۔"
"میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔"
"اتنی سیدھی سادی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ حالانکہ اپنے گھر میں تو تم بہت سمجھ دار کہلاتی ہو۔" اس کا طنزیہ لہجہ، عفت کو بہت برا محسوس ہوا۔
"لیکن میں اتنی بھی سمجھ دار نہیں ہوں۔ ہونے اور کہلانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ جیسے آپ کے گھر میں سبز قدم کہلائی جانے لگی ہوں لیکن ہوں نہیں۔" جانے کب کیوں اور کیسے یہ الفاظ اس کے لبوں سے نکل گئے اور توقع کے عین مطابق معراج تپ گیا۔
"یار تم ہر وقت میرے گھر والوں کے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہو۔" اس کا انداز ہتھے سے اکھڑا ہوا تھا۔ عفت نے بے ساختہ اگلی بات کو لبوں میں دبا لیا۔ (میں نہیں آپ کے گھر والے پیچھے پڑے ہیں میرے)
"سوری۔۔۔ میرا خیال ہے۔ میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔" عفت اب کی بار بھی کچھ نہیں بولی۔ لیکن جانے کہاں سے گھومتے گھامتے دو آنسو آنکھوں کی نچلی کناریوں پر ٹہلتے آ نکلے۔
دیر سے ہی سہی لیکن معراج کو اپنے یکدم تلخ ہو جانے کا احساس ہو گیا تھا۔ لیکن اگر ابھی یہ احساس اتنی دیر میں جاگ رہا تھا تو کیا پتا۔ بعد میں گہری نیند ہی سویا رہتا اور معراج کو پتا ہی نہ چلتا کہ وہ زیادہ بول گیا۔ کم بولا یا غلط۔۔۔
"میں فون بند کر رہی ہوں۔ میرا خیال ہے اس وقت ہم لوگ کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کر پائیں گے۔" اس کا ازلی دھیما اور نرم لیکن سنجیدہ انداز واپس لوٹ آیا۔
"میں تو کر سکتا ہوں۔ لیکن تم خود سوچو۔ ایک بندہ اتنی دیر انتظار کے بعد۔۔۔"
"معراج۔۔۔!" اب کی بار اس نے قدرے بلند آواز میں اس کا نام لیا۔ معراج کے کانوں نے پہلی بار اس کے لبوں سے سنا تھا۔ لیکن اتنا دو ٹوک، واضح اور حد درجہ سنجیدہ۔۔۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چپ کر گیا۔
"آپ کو ضرورت کیا ہے میرا اتنا انتظار کرنے کی۔ یوں راتوں کو جاگ جاگ کر خود کو ہلکان کرنے کی۔ میں آپ کی ہوں۔۔۔ اور آپ ہی کی رہوں گی۔ آپ کے پاس آ رہی ہوں نا۔ کچھ ہی دن باقی ہیں۔" اس نے گہری سانس لی۔ پھر بات کو مزید آگے بڑھایا۔
"پھر آپ کو نہ انتظار کی ضرورت رہے گی۔ نہ کسی سے کچھ بھی چھپانے کی۔" کتنے لطیف جذبات کی ترجمانی

کرتے الفاظ تھے۔ لیکن کتنی گمبھیر صورت حال کو جتا تا ہوا لہجہ..... وہ یوں تھی کہ بس بات ختم۔ اب وصل کے وقت تک کے لیے مکمل خدا حافظ۔

معراج سے کچھ بھی نہیں کہا گیا اور فون بند ہو گیا۔

اس نے ناگواری کی شدید لہر کو خود میں اٹھتے محسوس کیا اور عفت کو لگا وہ ابھی ذہنی طور پر معراج سے ہزاروں سال کے فاصلے پر ہے۔

☆ ☆ ☆

گھر واپسی پر ہمیشہ کی طرح انس نے مسکرا کر اس کا استقبال نہیں کیا۔ اس کے سارے تھکے ماندے وجود میں اصل تھکن اب اترنا شروع ہوئی تھی۔ وہ کچن میں کھڑا اپنے لیے چائے بنا رہا تھا۔ اس نے پشت پر جا کر سلام کیا۔ انس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

"کھانا تو کھا لیں۔ پھر پی لیجیے گا چائے۔"

"بھوک نہیں ہے۔" وہ کپ لے کر سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ انس منڈیر کے کنارے پر مگ رکھے ہتھیلیاں ٹکائے کھڑا تھا۔ وہ بھی خاموشی سے برابر میں آ گئی۔

انس جانتا تھا کہ سوہا برابر میں آ کر کھڑی ہوئی ہے۔ لیکن اپنی سوچوں میں اس قدر گم تھا کہ متوجہ ہی نہیں ہوا۔ سوہا کو اس کی پریشان کن خیالات کا علم تھا۔ لیکن وہ خود اس سلسلے میں بالکل بے بس تھی۔

"میں جانتی ہوں آپ بہت پریشان ہیں۔" اسے کچھ تو کہنا ہی تھا۔ انس کی خاموشی لاپروائی اور یوں خود ہی خود سے الجھتے رہنا۔ پریشان رہنا خود اس کے لیے بھی بہت تکلیف دہ تھا۔

"لیکن انس یوں پریشان رہنے سے' صرف آپ کا اپنا موڈ اور گھر کا ماحول ہی خراب ہوتا ہے اور بس....."

اس نے جواب نہیں دیا۔ سوہا نے بھی ہمت نہیں ہاری۔

میں یہ نہیں کہتی کہ ہنسیں بولیں قہقہے لگائیں۔ لیکن آپ یہ تو کر سکتے ہیں ناکہ اپنا ہر کام' ہر مسئلہ اللہ پر چھوڑ کر مطمئن ہو جائیں۔ جس نے پیدا کیا ہے۔ وہی پال بھی لے گا۔ اور جس نے مشکل دی ہے۔ وہی آسانی بھی دے دے گا۔ کیا آپ کا اس بات پر ایمان نہیں رہا۔"

اس کے انداز میں بے حد محبت تھی۔ انس نے ہارے ہوئے انداز میں سر جھکا لیا۔

"کیوں خود کو بلاوجہ بے مقصد و لاحاصل لایعنی سوچوں سے تھکا رہے ہیں۔" اس نے انس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ جواباً" انس اس کا ہاتھ تھام کر کمرے میں لے گیا۔ وہ بنا کسی مزاحمت کے چلتی ہوئی آئی۔ اسے بیڈ پر بٹھا کر انس اس کے برابر میں تکیے پر سر رکھ کر لیٹا اور آنکھیں موند کر اس کا ہاتھ اٹھا کر آنکھوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

"میں واقعی تھک گیا ہوں سوہا! میری تھکن سمیٹ لو۔" نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے آخری لمحات جس قدر بوجھل تھے' صبح ایک فون کال کے ذریعے اتنی ہی ہنگامہ خیز ہو گئی۔

"سوہا..... سوہا! اٹھو جلدی۔" انس نے اس کا کندھا بے تابی سے جھنجوڑ کر اٹھایا۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے اس کا سرخ جوشیلا چہرہ دیکھا۔

"آفس سے فون آیا ہے۔ مجھے بلایا ہے ایمرجنسی میں۔" اس کی نیند بھک سے اڑی تھی۔

"ہیں..... کون سے آفس سے۔"

"ارے میرے آفس سے۔ جلدی اٹھو جلدی کرو۔ میرے کپڑے نکالو اور دعا کرو کہ کوئی اچھی خبر ہی سننے کو ملے۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے بھی پہلے سوہا چھلانگ مار کر بیڈ سے اتر کر الماری کی طرف لپک چکی تھی۔ برق رفتاری سے کپڑے استری کر کے نیچے آئی۔ تیزی سے ناشتا تیار کیا۔ اس کا انداز دیکھ کر نائلہ بھی کچھ اندازہ لگا چکی تھی۔ چنانچہ اسے بھی فوراً "خوشی میں شریک کر لیا اور مستقل درود پاک کے ورد کرتی رہی۔

اس کی دعاؤں کو بہت زیادہ انتظار نہیں کروایا گیا تھا۔ اس کے صبر کو انتہا تک نہیں آزمایا گیا تھا۔ ابھی تو تکلیف شروع ہی ہوئی تھی کہ مرہم آن اترا۔

وہ اللہ پاک کی جتنی بھی شکر گزار ہوتی کم تھا۔

انس اور حدید ساتھ ساتھ ہی گھر سے نکلے تھے۔

اور انس کے گھر سے نکلنے کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد مسرت و شادمانی میں ڈوبی اس کی کال بھی ریسیو ہو گئی تھی۔

انس اور اس کے دوسرے ساتھیوں پر لگے جھوٹے اور الٹے سیدھے الزامات غلط ثابت ہو گئے تھے۔ کمپنی کے اصلی مجرم پکڑے گئے تھے۔ نتیجتاً "ان سب کی خود بخود یاد بھی آ گئی تھی اور اہمیت بھی واضح ہو گئی تھی۔

انس کو نہ صرف نوکری پر باعزت طریقے سے بحال کر دیا گیا تھا۔ بلکہ پروموشن جو عرصے سے رکی ہوئی تھی' سمیت مراعات اور تنخواہ میں اضافہ بھی کر دیا گیا تھا۔ سوہا کی آنکھوں سے فون سنتے سنتے جو آنسو بہنا شروع ہوئے تو فون بند کرنے کے بعد تو وہ باقاعدہ رونے ہی لگی۔

نائلہ جو قریب ہی کھڑی خوشی سے تمتماتے چہرے کے ساتھ ساری باتیں سن رہی تھی۔ مسکرا اٹھی اور بے ساختہ اسے گلے لگا لیا۔

"چلو شکر ہے یہ فکر تو تمام ہوئی۔ جاؤ اب جلدی سے شکرانے کے نوافل ادا کرو۔ میں کھانا دیکھ لوں پھر امی کو فون کر کے پوچھوں کیا کیا سامان رہ گیا ہے۔" اس کے چہرے پر بجی خوشی کے بڑے انوکھے رنگ جھلملا رہے تھے۔

سوہا سجدہ شکر ادا کر کے واپس پلٹی تو نائلہ لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی۔ سیل فون اس طرح ہاتھ میں تھا۔ جیسے ابھی بھی بات ختم کی ہے۔

"کیا ہوا۔ ہو گئی تائی اماں سے بات۔"

جب وہ بولی تو گھر کی خاموشی میں اپنی خوشی سے چور آواز کی کھنکھناہٹ خود اسے بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"ہاں ہو ہی گئی۔ اتنا کچھ کر لو۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ رہ ہی جاتا ہے۔" کچھ دیر پہلے کے برعکس اب اس کا انداز کچھ تھکا تھکا سا تھا۔

"کیوں کیا رہ گیا اب۔" اس نے فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور گلاس سمیت لا کر سینٹر ٹیبل پر رکھ لی۔

"سب سے بڑی چیزیں۔ فرنیچر اور زیور....." نائلہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ لوگ جاہلانہ رسم و رواج کو چھوڑنے کے بجائے' اسے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھاوا ہی دیتے رہتے ہیں۔"

"ایسے مت کہو..... جہیز تو ہمارے نبی پاک نے بھی اپنی دختر کو دیا تھا۔ یہ تو ہم ہی لوگ ہیں جو نمود و نمائش کے چکروں میں پڑے ہیں۔"

"اماں زیور کے لیے پریشان ہیں اور ان کی پریشانی....." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور اپنی سوچ میں گم ہو گئی۔

سوہا کب اس کے پاس سے اوپر چلی گئی تھی اور کب واپس آئی پتا ہی نہیں چلا۔ اس کے ہاتھ میں گہرے کاہی ہرے رنگ کا مخملیں ڈبا تھا۔

"یہ لو..... یہ میرا سیٹ ہے۔ جو شادی پر امی نے دیا تھا۔"

اس نے جس قدر سہولت اور آرام سے کہہ کر نائلہ کی طرف بڑھایا تھا۔ نائلہ اتنی ہی بے یقینی سے کھڑی ہو گئی۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔

"دل...... لیکن سوہا پلیز...... پلیز لے کر جاؤ واپس۔ کیوں لے کر آئی ہو تم۔"

سوہا ب ناراضی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں کیا عفت میری بہن نہیں ہے۔ یا اگر میرے مالی حالات اچھے نہیں تو میں خاموشی سے سب کی پریشانی دیکھتی رہوں اور ایک کام آنے والی چیز میرے پاس ہے۔ اسے سینے سے لگا کر رکھوں۔" نائلہ ابھی بھی متذبذب سی کھڑی تھی۔

"اگر تم نے نہیں لیے نا نائلہ۔ تو میں سمجھوں گی تم مجھے اپنی بہن نہیں سمجھتیں۔" آخری بات تابوت میں کیل جیسی تھی۔ لیکن نائلہ کو جانے کیا ہوا۔ اس نے ڈبا ہاتھ سے لینے کے بجائے سوہا کو گلے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

سوہا اس ردعمل کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ اس کے اس طرح رونے سے گھبرا سی گئی۔

"نائلہ...... نائلہ کیا ہو گیا۔ پلیز خود کو سنبھالو۔ پلیز......"

اور نائلہ کے لیے خود کو سنبھالنا ہی تو مشکل تھا۔ یہی وہ زیور تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ذلت و رسوائی کی آگ میں جلتے جلتے رہ گئی تھی۔ اسی زیور کے لالچ نے اس کی جان بخشی کروائی تھی۔ یہی زیور شبیر حسین لینے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ اور اس کی جان تک لے لینے کے درپے تھا۔

اور اب یہی زیور تھا جو بالواسطہ ہی سہی لیکن اس کی مشکل حل کرنے کے لیے سامنے آگیا تھا۔ وہ کیا کیا یاد کرتی اور کس کس طرح نہ پچھتاتی۔

"کچھ نہیں بس...... ذرا آج دل......" اس سے نہ بات بتائی گئی نہ مکمل کی گئی۔ بس بے ربط سا بول کر چپ کر گئی۔

"بس اب میں تمہیں روتے دھوتے نہ دیکھوں۔ خاموشی سے یہ ڈبا لو اور سنبھال کر رکھ دو۔ وے دینا تائی اماں کو انس اور میری طرف سے عفت کی شادی کا تحفہ۔ لوبانی پیو۔" شاباش اور ہاں عفت کے سسرال والوں کو انس کی نوکری والی خوش خبری ضرور سنا دینا۔" اس کا اشارہ معراج کے گھر والوں کی ذہنیت کی طرف تھا۔ اس نے بولتے ہوئے گلاس میں پانی ڈال کر اسے دیا۔ جسے وہ غٹاغٹ چڑھا گئی۔ پھر گلاس رکھ کر چند لمحے سوہا کا چہرہ دیکھتی رہی۔ تب بالکل بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔

"سوہا! پلیز مجھے معاف کر دو۔ میری ان ساری حرکتوں کے لیے جن سے تمہیں تکلیف پہنچی۔" اب کے منہ کھلنے کی باری سوہا کی تھی۔

یہ اس کی زندگی کے وہ آخری الفاظ تھے۔ جنہیں وہ نائلہ کے منہ سے سننے کی توقع رکھتی تھی۔

☼ ☼ ☼

انس نے پورا دن آفس میں گزارا۔ اس کی واپسی مٹھائی کے ڈبے سمیت ہوئی تھی۔ حدید چونکہ پہلے ہی گھر آ چکا تھا۔ اس لیے اس کی واپسی پر نائلہ نے چائے کے ساتھ ہی تھوڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ چائے پی کر وہ اور سوہا رضوانہ کی طرف چلے گئے۔ ابھی انس کی نوکری کا سرپرائز وہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ بھی نائلہ ہی کا مشورہ تھا کہ فون پر خبر سنانے کے بجائے سامنے جا کر خوشی دی جائے گی تو مزا دوبالا ہو جائے گا۔

رضوانہ کے گھر سے نکل کر ان کا ارادہ مزنہ کے یہاں جانے کا بھی تھا۔ کیونکہ حسیب ہاسپٹل سے ڈس چارج

ہو کر گھر آچکا تھا اور ماما حسیب کے ساتھ مزنہ کے یہاں شفٹ ہو چکی تھی۔

ان دونوں نے نائلہ اور حدید سے بھی چلنے کے لیے بہت اصرار کیا۔ خود نائلہ کا بھی بہت دل چاہ رہا تھا۔ لیکن حدید کو مستقل انکار کرتے دیکھ کر خود بھی رک گئی۔

اور کبھی کبھی انسان یونہی کسی کام کے لیے چل پڑتا ہے تو بہت سا بھلا مل جاتا ہے اور کبھی بے وجہ کوئی بات کرتے کرتے رک جاتا ہے اور زندگی بھر کا خسارہ دامن میں بھرلیتا ہے۔ کہ یہ زندگی اس کائنات کی سب سے بے اعتبار چیزوں میں سے اول نمبر پر آتی ہے۔ جو ابھی ہے تو ابھی نہیں۔۔۔ انسان بے خبر ہے۔ وہ بے خبر ہی رہتا ہے اور بے خبری ہی میں۔۔۔

وہ بھی بے خبر تھی۔ جبھی ڈور بیل کی مسلسل بنا رکے بجتی ہوئی آواز پر گنگناتے ہوئے اس خیال سے بے فکری میں برتن دھوتی رہی کہ حدید گھر پر ہے تو وہی دروازے تک جائے گا۔ لیکن کیوں۔۔۔ کیوں سوچا اس نے کہ حدید دروازے تک جائے۔ جب وہ ہمیشہ خود جاتی رہی تھی تو اب بھی چلی جاتی۔ لیکن شاید تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ اور تقدیر کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔

"کون ہے۔" حدید بولتا ہوا صحن کراس کر کے دروازے تک گیا۔

اس نے کان لگا کر آنے والے کی آہٹ سننے کی کوشش کی۔ پھر نا کام ہو کر پوری رفتار سے بہتے شور مچاتے نل کو بند کیا۔ اور کانچ کی پلیٹیں ہاتھ میں لیے پلٹی تو کھڑکی سے نظر آتے والا منظر اس کی جان نکالنے کے لیے کافی تھا۔

حدید کو گریبان سے پکڑے اس کی گردن پر چھری رکھے اندر کی طرف تیز لیکن بے آواز قدموں سے بڑھتا وہ کوئی اور نہیں شبیر حسین ہی تھا۔

کانچ کی پلیٹیں ہاتھوں سے چھوٹیں اور بے پناہ شور کے ساتھ پختہ فرش سے ٹکرا کر کرچیوں میں بٹ گئیں۔

چھناکے کی زوردار آواز کے بعد موت کا سا سناٹا چھا گیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼